عین المعارف

حضرت آسیؔ غازی پوری

2231

عین المعارف

حضرت آسیؔ غازی پوری

ناشر ادارۂ یادگارِ آسیؔ غازی پوری
معرفت سیّد محمد منظر
٦١١۔ اے، قمر ہاؤس کراچی (فون: ٢٠١٣٩٨)

کتابت عبداللطیف طاہر، کراچی

ملنے کا پتا مکتبہ رضویہ، آرام باغ روڈ، کراچی

مطبع گولڈن گرافکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

تاریخِ اشاعت اکتوبر ١٩٨٨ء

تعداد ایک ہزار

ھدیہ 150/-

ترتیب

الف ـ تعارف

ب ـ نقد و نظر

ج ـ عین المعارف

غزل

مخمس

مثلث

سلام

قصیدہ

قطعہ تاریخ

رباعی

اختتامیہ

نذرانۂ عقیدت

دیوانِ آسیؔ (عینُ المعارف) کی نئی طباعت کراچی میں پہلی دفعہ ہو رہی ہے۔ ویسے تو یہ دیوان برِصغیر پاک و ہند کے معروف شعراء اور عوام میں مشہور و معروف ہے اور غیر منقسم ہندوستان میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

عین المعارف کی مکمل اور جامع طباعت حضرت سیّدی و مرشدی سید شاہد علی سلیمی رشیدی سبز پوش قدس سرہٗ العزیز سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جونپور کی حیاتِ مبارکہ میں ہوئی اِسی طباعت کو ازسرِ نو پاکستان میں سید محمد منظر خلف الرشید حضرت مولانا سید عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ سادات پوری طبع کرانے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

یہ دیوان حضرت قطبُ العارفین شیخ **محمد عبد العلیم** آسیؔ رشیدی قدس سرہٗ العزیز کے الہامی اور عارفانہ کلام کا مجموعہ ہے۔ خود حضرت آسیؔ رحمۃ اللہ علیہ اپنی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں' یہ شعر دیوانِ آسیؔ کی لوح پر درج ہے ؎

شعر گوئی نہ سمجھنا کہ مرا کام ہے یہ ؎ قالبِ شعر میں آسیؔ فقط الہام ہے یہ

حضرتِ آسیؔ رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی' اُن کے علم و تصوّف نیز اُن کی شاعری سے متعلق ایک مبسوط دیباچہ حضرت سیّدی سبز پوش رحمۃ اللہ علیہ نے شاملِ دیوان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں میرے جیسا کم علم اور کم مایہ کسی قسم کے اضافہ کی جرأت نہیں کر سکتا اور نہ میں خود اس میں کسی قسم کے اضافہ کی ضرورت سمجھتا ہوں۔

حضرت کا کلام پڑھنے کے بعد ہی کسی سخن فہم شاعر اور ادیب کو شاعری میں اُن کے مقام اور مرتبہ کا پتہ چل سکتا ہے۔ حضرت سبز پوش رحمۃ اللہ علیہ خود بھی ایک یگانۂ روزگار شاعر اور سخن فہم تھے فانیؔ تخلص رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے حضرت آسیؔ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری سے متعلق جو کچھ سمجھا ہے جس کا انہوں نے اپنے دیباچہ میں اظہار کیا ہے یہ انہیں کا حق ہے۔ حضرت آسیؔ رحمۃ اللہ علیہ کا شمار اساتذہ شعراء میں ہوتا ہے۔ اور میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ اُردو شاعری کے عارفانہ کلام میں شاید ہی کوئی ان کا ہم پلّہ ثابت ہو سکے۔ کلام پڑھ کر دِلوں میں عشق و محبّت کی شمع روشن ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ کرام اور اہل بیتِ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے خصوصی قربت اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی نثر کے مقابلہ میں اشعار قلوب پر زیادہ اور جلد اثر انداز ہوتے ہیں۔ قلوب پر ایک خاص کیفیت رُونما ہوتی ہے۔ اسی لیے صوفی شعراء نے نعت گوئی اور منقبت کو اپنا شعار بنایا ہے اور اکثر صوفیاء کے نزدیک قوالی اور شعری محفلیں تبلیغِ دین کا ایک مؤثر ذریعہ تصور کی جاتی ہیں۔

دیوانِ آسیؔ کی اس جدید طباعت کا انتظام اور اہتمام جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا ہے حضرت کے سلسلۂ تصوّف سے منسلک ایک صاحبِ عزم و ہمت جناب سید محمد منظر نے کیا ہے۔ سید محمد منظر حضرت پیرِ طریقت صوفیٔ باصفا مولانا سید عبدالشکور صاحب سادات پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۹۸۴ء مطابق ۱۴۰۴ھ) کے صاحبزادے ہیں۔ اور خصوصی دینی شغف نیز سلسلۂ خانقاہِ رشیدیہ سے والہانہ عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔ سادات پور بہار کا یہ خانوادہ کئی پشت سے اس سلسلہ سے منسلک چلا آرہا ہے۔ حضرت مولانا سید عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت آسیؔ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۵ھ) سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ خلافت اور اجازت حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۹۵۳ء) سے حاصل ہوئی تھی۔

الحاج سید عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات کراچی میں سید محمد منظر کے مکان پر ہوئی۔ سید صاحب مرحوم کو دیکھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ حضرت اپنے پیرانِ عظام کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اُن سے حسنِ عقیدت اور اُن کی پیروی میں اُنہیں کمال حاصل تھا۔ سید صاحب مرحوم کی تعلیم و تبلیغ کا ایک وسیع سلسلہ قائم تھا۔ ۱۹۷۷ء میں حج کی سعادت حاصل ہوئی اور اس کے بعد سے عشق و محبتِ نبوی کی کیفیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ آج بھی ان کے ہزاروں مریدین اور معتقدین راجستھان، بہار، بنگال اور یوپی (بھارت) میں موجود ہیں۔ حضرت نے کراچی میں جناب سید منتخب الحق صاحب قادری[1] سابق صدر شعبۂ اسلامیات و عربی کراچی یونیورسٹی کو اجازت اور خلافت سے سرفراز فرمایا ہے۔

خاندانِ رشیدیہ جونپور سے متعلق ایک اُردو تصنیف سمات الاخیار ہے۔ اس کتاب میں حضرت سید صاحب مرحوم کے خانوادہ کا ذکر اس سلسلہ کے خلفاء اور مریدین میں خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔

---

[1] مولانا منتخب الحق قادری، ممتاز عالمِ دین، شعبہ معارف اسلامیہ جامعہ کراچی کے ڈین اور انتقال سے قبل تک اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن اور دارالعلوم قادریہ کراچی کے پرنسپل اور شیخ الحدیث رہے۔ ۱۲ شوال ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء شام چار بجے وفات پائی اور کراچی یونیورسٹی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

سمات الاخیار خانقاہ رشیدیہ کے بزرگانِ دین کے حالات سے متعلق ایک اچھی تصنیف ہے۔ کاش سیّد منظر صاحب اس کی بھی پاکستان میں طباعت کا انتظام کرتے تو اچھا ہوتا۔ سیّد صاحب اسی سلسلۂ تصوّف کی ایک مشہور و معروف دُعا دُعائے گازرونیہ بھی چھپوا کر سعادتِ دارین حاصل کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سیّد منظر صاحب کو جذبۂ دینی سے سرشار کیا ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے اس جذبہ کو قائم رکھے تاکہ وہ مزید دینی خدمات انجام دے کر اپنے خانوادے کا نام روشن کریں۔

مکتبۂ رضویہ گاڑی کھاتہ کراچی اہل سُنّت و جماعت کی کتابوں کا مرکز ہے۔ قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی خطیب نیومیمن مسجد اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔ انہی کی زیرِ نگرانی دیوانِ آسیؔ کی بھی طباعت ہوئی ہے۔ ان کے گھرانے کے افراد بھی سلسلۂ تصوّف میں حضرت آسیؔ علیہ الرحمۃ سے وابستہ ہیں۔ بالخصوص ان کی والدۂ ماجدہ زوجہ حضرت صدر الشریعۃ مولانا امجد علی اعظمی مصنّف بہارِ شریعت حضرت سبز پوش رحمۃ اللہ علیہ سے مرید ہیں۔ احقر کو بھی سلسلۂ قادریہ میں اسی خانقاہ سے تعلّق و وابستگی ہے۔

دیوانِ آسیؔ کا مطالعہ کرنے والوں سے استدعا ہے کہ وہ ہم سب کو بالخصوص سیّد محمد منظر صاحب کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو دینِ متین اور مذہب اہل سنّت و جماعت پر قائم رکھے اور اسی پر خاتمہ بخیر کرے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

احقر

(پروفیسر) **شاہ فرید الحق** عفرلہٗ
۲۷۲ - بی - بلاک نمبر ۶
گلشنِ اقبال۔ کراچی ۴۷

۲۵ جولائی سنہ ۱۹۸۶ء
۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۴۰۶ھ

سیّد محمد منظر' تعارف

اللہ رب العزت کا فضل وکرم اور اُس کی عنایتِ بے پایاں ہے کہ اُس نے کراچی کی ممتاز کاروباری شخصیت اور معروف تاجر محترم جناب سید **محمد منظر** صاحب کو مسلکِ حق کی خدمت کے لیے توفیق عطا فرمائی۔ موصوف کراچی میں اہلسنت وجماعت کے منفرد اور ممتاز ادارے دارالعلوم نوریہ رضویہ ٹرسٹ' کہکشاں' کلفٹن کے روحِ رواں ہیں۔ اہلِ عقیدت سے آپ کی محبت کا اندازہ علمائے دین، صوفیاءِ کرام سے گہری عقیدت و محبت سے ہوتا ہے۔ دین سے یہ شغف اور علمائے دین سے یہ محبت اُن میں آخر کیوں نہ پائی جائے کہ ان کا نسبی تعلق ہی برِ صغیر کی ایک نہایت برگزیدہ شخصیت شمس العارفین حضرت قبلہ الحاج پیر سید عبدالشکور صاحب علیمی رشیدی سادات پوری رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ سادات پور ایک مردم خیز خطہ ضلع سارن (بہار) میں ہے۔

یکم ستمبر ۱۹۳۳ء کو قطبِ عالم حضرت مولانا سید عبدالعلیم صاحب آسی کے خلیفۂ مجاز شمس العارفین حضرت قبلہ الحاج پیر سید عبدالشکور صاحب علیمی رشیدی (جنہیں بعد ازاں حضرت قبلہ آسی کے خلیفۂ اجل حضرت سید شاہد علی صاحب علیمی رشیدی سے بھی بیعت وارشاد کی اجازت ملی) کے ہاں ایک سعید روح عالمِ وجود میں آئی۔ والد ماجد نے بیٹے کا نام محمد منظر رکھا۔

ابتدائی تعلیم والدِ گرامی کے زیرِ سایہ اور زیرِ نگرانی ہوئی۔ بعد ازاں رائل ہائی اسکول سکم میں تعلیم حاصل کی۔ پیرِ طریقت حضرت شاہ سید محمد مصطفےٰ علی (شہید) سبز پوش' سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ کے دستِ مبارک پر سلسلہ قادریہ احمدیہ میں بیعت ہونے کی سعادت ۱۹۵۷ء میں حاصل ہوئی۔

۱۹۵۲ء میں چٹاگانگ مشرقی پاکستان منتقل ہو گئے اور وہاں کاروبار شروع کر دیا۔ سقوطِ ڈھاکہ سے کچھ عرصہ پہلے ۱۹۷۱ء میں آپ مشرقی پاکستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے کراچی تشریف لے آئے۔ اور یہاں اپنے کاروبار کا آغاز کر دیا۔ کاروباری اور تجارتی حلقے میں آپ ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں بھی صوفیائے کرام کے نقشِ قدم پر چل کر رفاہی کاموں میں حصہ لیا۔ اُس کا صلہ بارگاہِ الٰہی سے یہ ملا کہ جب مکتی باہنی کے لوگ غیر بنگالیوں کا قتلِ عام کر رہے تھے اُس وقت سید محمد منظر صاحب نے بہت سے افراد کو بچا کر ان کو پاکستان بھیجا۔ ۷ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۸۴ء کو محترم سید

محمد منظر صاحب قبلہ کے والدِ گرامی حضرت قبلہ الحاج پیر سید عبد الشکور صاحب علیمی رشیدی سجادہ نشین خانقاہِ رشیدیہ کا چھپرا میں وصال ہو گیا۔ سادات پور میں اپنے خاندانی قبرستان میں آپ کا آستانہ مُبارک ہے۔

اپنے والدِ گرامی کے چہلم میں شرکت کے لیے جناب سید محمد منظر صاحب سادات پور تشریف لے گئے جہاں ہندوستان کے گردونواح سے مریدین و معتقدین کا ۱۹ فروری ۱۹۸۴ء کو حضرت کے چہلم کے موقع پر سادات پور میں ایک عظیم الشان اجتماع ہوا۔

خانقاہِ رشیدیہ کے موجودہ سجادہ نشین حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب مدظلہٗ جو حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ مصنّف بہارِ شریعت کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں' اور اجمیر شریف سے حضرت خواجہ غریب نواز کے گدّی نشین درویش سید صالح محمد صاحب چشتی اور حضرت مولانا غلام آسی صاحب المعروف آسی پیا کے علاوہ ہندوستان بھر کے ممتاز علمائے کرام اور مشائخِ عظام نے بھی شرکت فرمائی۔

اس اجتماعِ عظیم میں حضرت قبلہ پیر سید عبد الشکور صاحب علیمی رشیدی کی سجادہ نشینی کے معاملے پر بھی غور کیا گیا۔ باہم مشاورت سے یہ طے پایا کہ حضرت قبلہ پیر سید عبد الشکور صاحب کے برادرِ گرامی حضرت مولانا حافظ سید عبد الرزاق صاحب سے رائے لی جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ انہوں نے بطیبِ خاطر تمام بزرگوں کی موجودگی میں محترم جناب صاحبزادہ سید محمد منظر صاحب کا نامِ نامی اسمِ گرامی سجادہ نشینی کے لیے پیش کیا۔ اسی مجلس میں تمام بزرگانِ سلسلہ کے سامنے سجادہ نشینی کی تمام رسومات خرقہ پوشی' دستار بندی اور تبرکات وغیرہ سے نوازا گیا۔ رسمِ دستار بندی سجادہ نشین خانقاہِ رشیدیہ حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب مدظلہٗ العالی کے مُبارک ہاتھوں سے انجام پائی۔

اپنے والدِ گرامی کی رسمِ چہلم میں شرکت کر کے جب صاحبزادۂ محترم جناب سید محمد منظر صاحب قبلہ پاکستان واپس تشریف لانے لگے تو اجمیر شریف میں حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں وہاں کے گدّی نشین درویش سید صالح محمد اور دہلی میں درگاہ حضرت خواجہ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے امام اور سجادہ نشین حضرت الحاج خواجہ سید اسلام الدین صاحب نظامی کے مبارک ہاتھوں سے بھی سید محمد منظر صاحب کی دستار بندی ہوئی۔ اسی طرح آستانۂ عظیمیہ درگاہ حضرت سید عظیم علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ شاہ پورہ بھیلواڑہ' راجستھان اور حضرت قبلہ پیر الحاج سید عبد الشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے برادرِ گرامی حضرت سید عبد البصیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آستانۂ عالیہ بصیریہ خواجہ باغ' بیگون شریف چتوڑ گڑھ میں جناب ماسٹر عبد العزیز صاحب خلیفۂ مجاز حضرت قبلہ پیر سید عبد الشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بابرکت ہاتھوں سے محترم صاحبزادہ سید محمد منظر صاحب کی دستار بندی ہوئی۔

صاحبزادہ سید محمد منظر صاحب چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ایک بھائی سید اختر احمد صاحب اب سے تین برس قبل کراچی میں انتقال کر گئے۔ سب سے بڑے بھائی سید محمد اصغر صاحب کراچی میں کاروبار

کرتے ہیں اور ماشاءاللہ ممتاز تاجر ہیں۔ چھوٹے بھائی سید نفیس احمد صاحب انجینئر ہیں اور جرمنی میں مستقل قیام ہے۔ ایک بہن سیدہ اسماء خاتون زوجہ سید محمد رفیع صاحب بھی کراچی میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے دنیوی نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ سب سے چھوٹی بہن سیدہ راشدہ خاتون زوجہ سید نصیر حسن صاحب چھپرہ بھارت میں ہیں۔

والدہ ماجدہ سیدہ قریشہ خاتون شروع ہی سے بچوں کے ساتھ پاکستان آگئی تھیں اور جناب منظر صاحب کے ساتھ مستقل قیام رہا۔ ۱۹۷۷ء میں حج کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ان کا وصال ۳۰ شوال ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۱ ستمبر ۱۹۸۰ء کو کراچی میں ہوا۔ دوسرے روز مولانا شاہ احمد نورانی نے جمعہ کی نماز کے بعد نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ڈیفنس سوسائٹی کے قبرستان میں روضۂ مبارک ہے۔

سید محمد منظر صاحب کی شادی اپنے ہی خاندان میں عم محترم جناب حافظ سید حبیب الحسن صاحب خلیفہ حضرت سید شاہ شاہد صاحب سبز پوش رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی سیدہ صفیہ خاتون سے ۱۲ دسمبر ۱۹۵۷ء کو سادات پور میں ہوئی۔ عقد حضرت شاہ سید محمد مصطفٰے (شہید) سبز پوش سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جونپور کے مبارک ہاتھوں سے انجام پایا۔

محترم سید محمد منظر صاحب کے بڑے صاحبزادے سید ممشاد منظر امریکہ میں زیرِ تعلیم ہیں دوسرے صاحبزادے سید شمشاد منظر اور سب سے چھوٹے سید ریشاد منظر کراچی ہی میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ان کے علاوہ چار صاحبزادیاں ہیں۔ اللہ رب العزت حضرت قبلہ پیر عبدالشکور صاحب علیمی رشیدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس خانوادے کو سلامت رکھے۔ ان سب بچوں کو دین و دنیا میں ترقی سے نوازے اور عمر دراز کرے محترم جناب سید محمد منظر صاحب کے ہاں اکثر و بیشتر آنے جانے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ماشاء اللہ سید صاحب کے تمام بچے نیک سیرت، سعادت مند اور دینی اور دنیاوی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں۔

ہم پاکستانیوں کی خوش نصیبی ہے کہ سلسلۂ علیمیہ رشیدیہ کے نمائندے اور خلیفۂ مجاز صاحبزادہ سید محمد منظر صاحب آج ہمارے درمیان موجود ہیں اور اپنے روحانی فیوض و برکات سے ہمیں نوازتے رہتے ہیں۔ کئی سال پہلے اوراد و وظائف کی مشہور کتاب "دعائے گاز رونیہ" طبع کرا کر تمام مریدین و معتقدین میں تقسیم کرا چکے ہیں۔ اور اب انہی فیوض و برکات میں سے اپنے وقت کا مشہور و معروف دیوان "عین المعارف" کی اشاعت بھی ہے جو دیوانِ آسیؔ کے نام سے پورے ہندوستان میں معروف ہے۔ اور جو تقریباً چالیس سال سے ناپید ہے۔ اس کی اشاعت و طباعتِ ثانی کا شرف بھی محترم جناب سید محمد منظر صاحب قبلہ کو حاصل ہو رہا ہے۔

محترم جناب سید منظر صاحب قبلہ اس گراں قدر تحفہ کو خالصۃً لوجہ اللہ اپنے والدِ گرامی

حضرت قبلہ پیر الحاج سید عبدالشکور صاحب علیمی رشیدی قدس سرہٗ العزیز کو ایصالِ ثواب کے لیے پُرانے نسخوں سے من وعن بغیر کسی تبدیلی کے شائع کرکے مریدین و معتقدین سلسلہ کی خدمت میں اصل لاگت پر تحفۃً پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ ان نسخوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی منظر صاحب نے خانقاہِ رشیدہ کے نام وقف کردی ہے۔

محترم جناب سید محمد منظر صاحب تو اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کی تعریف و توصیف کی جائے اور ان کی خوبیاں منظرِ عام پر لائی جائیں وہ تو اپنی نیکیوں کو پوشیدہ سے پوشیدہ تر رکھنا پسند کرتے ہیں مگر میں نے ان کی طبیعت کے خلاف یہ چند سطریں تحریر کر دی ہیں تاکہ دوسرے اصحاب میں بھی دینی خدمت کا ذوق وشوق پیدا ہو اور وہ بھی تبلیغ واشاعتِ دین میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

قارئینِ کرام سے التماس ہے کہ دیوانِ آسیؔ کا بغور مطالعہ فرماکر اس کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہوں اور حضرتِ قبلہ پیر سید عبدالشکور صاحب رشیدی علیمی رحمۃ اللہ علیہ کے اہلِ خاندان کے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ان کو خدمتِ خلق اور رشد و ہدایت کی توفیق مزید بخشے۔ آمین ثم آمین۔

مُلتمسِ دُعا

(مولانا قاری) رضاء المصطفیٰ اعظمی

خطیب نیومیمن مسجد بولٹن مارکیٹ کراچی

صدر ورلڈ اسلامک مشن پاکستان کراچی

۲۷ر جولائی ۱۹۸۶ء

۱۹ر ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ

اظہارِ تشکّر

تاریخ نے اپنے سینہ میں صرف قوموں کے عرُوج و زوال کی داستانوں کو ہی محفوظ نہیں رکھا بلکہ اس میں صاحبانِ علم و فن کے تذکرے اور اُن کی شاہکار تصانیف کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حملہ آوروں نے صرف انسانوں کی بستیاں ہی نہیں اجاڑیں بلکہ کتب خانے بھی ان کی بربریّت کا شکار بنے اور یوں دنیا ایک بہت بڑے علمی ذخیرے سے محروم ہو گئی۔ بے شمار کتابیں زمانے کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ میرے خیال میں تاریخ کا سب سے المناک باب وہ ہے جس میں کتب خانوں کے جلانے اور ناپید ہو جانے کا تذکرہ ہے۔

اہلِ علم حضرات "دیوانِ آسیؔ" کی اہمیت سے واقف ہیں اور یہ حقیقت بھی اُن سے پوشیدہ نہیں کہ "دیوانِ آسیؔ" ایک مدت سے نایاب تھا۔ ڈر تھا کہ یہ "نایابی" "ناپیدی" میں تبدیل نہ ہو جائے چنانچہ قبلہ والد بزرگوار کی دلی آرزو تھی کہ "دیوانِ آسیؔ" حسین کتابت اور جدید طرز کی نفیس طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے مگر افسوس ان کی یہ آرزو ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی جس کا مجھے بے حد قلق ہے لیکن ان کی خواہش کا احترام میرے دل پر نقش ہو گیا اور اسی نے مجھے اس منصوبہ کی تکمیل کا نیا عزم بخشا۔ چنانچہ میں نے اس سلسلہ میں کئی صاحبانِ علم و ادب سے رجوع کیا اور اس کام کی تکمیل کے لیے ان کی علمی خدمات سے استفادہ کی درخواست کی مگر افسوس کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہ آیا۔

ایک بار تو پورے دیوان کی کتابت مکمل ہو کر سامنے آ گئی لیکن کتابت کا معیار انتہائی گھٹیا تھا۔ پھر ستم بالائے ستم متن میں اس قدر اغلاط تھیں کہ ان کی تصحیح کا کام جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اگرچہ اس نوع کی پریشانیوں سے ذہنی پریشانیوں میں اضافہ ہوا مگر میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

اس کے علاوہ یہ یقین تھا کہ اس کام کی نسبت روحانی سلسلہ کے جن بزرگوں سے ہے وہ اس کی تکمیل کے لیے کسی ایسی شخصیت کو سامنے لائیں گے جو اس کے لیے موزوں ترین

ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس دوران میں اتفاقاً نہیں بلکہ معجزاتی طور پر جناب شاہ محی الحق فاروقی غازی پوری سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے اپنی آرزو اور اس کی تکمیل کے سلسلہ میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ فاروقی صاحب سے کیا۔ اور ان سے مدد کا طالب ہوا۔ بزرگوں کا کرم اور بزرگانِ دین سے فاروقی صاحب کی عقیدت مندی اور ان کے اعلیٰ ادبی ذوق نے میری مشکل آسان کر دی۔ فاروقی صاحب نے اس کام کی تکمیل کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اور یوں یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ اگرچہ تاخیر کے ساتھ۔ مگر

ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

میں جناب محترم فاروقی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود دیوانِ آسیؔ کی طباعت اپنی نگرانی میں مکمل کرائی۔ وہ کام جو بظاہر ناممکن نظر آنے لگا تھا اپنے عزم اور علمی صلاحیتوں سے ممکن کر دکھایا۔ ؎

تم جو اپنے شریکِ حال ہوئے
گردشِ آسماں سے کچھ نہ ہوا

میری دعا ہے میری دلی آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ فاروقی صاحب کو اپنے فضل سے نوازے، ان کے دینی و دنیاوی درجات بلند فرمائے اور بزرگانِ دین کی شفقتوں کا سایہ ہمیشہ ان پر سایہ فگن رہے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

۱۱ فروری ۱۹۸۸ء

سیّد محمد منظر سادات پوری
۳۱۔ ای۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی۔ پاکستان

معروضات

۱۹۸۶ء کے اواخر میں، میں حکومتِ پاکستان وزارتِ مالیات کی جانب سے وزارتِ صنعت اور وزارتِ مواصلات کے نائب مشیرِ مالیات (ڈپٹی فنانشیل ایڈوائزر) کے طور پر مامور تھا۔ انہی دنوں سرفراز الحق صاحب (ڈپٹی ڈائرکٹر، محکمہ رسد، حکومتِ پاکستان) کے دفتر میں سید محمد منظر صاحب سے میری ملاقات ہوئی اور جلد ہی یہ اتفاقی ملاقات دوستانہ تعلقات میں تبدیل ہوگئی جس کا اصل سبب میں منظر صاحب کی خوش مزاجی ہی کو قرار دے سکتا ہوں کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے انہیں گوناگوں خوبیوں کا حامل انسان پایا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرا آبائی تعلق ہندوستان میں ضلع غازی پور (قصبہ بحری آباد) سے ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ "عین المعارف" کا نیا ایڈیشن شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں بلکہ اس کی کتابت بھی مکمل ہوچکی ہے۔ میں نے جب انہیں یہ بتایا کہ کم یاب ہونے کے باوجود پاکستان میں جن چند لوگوں کے پاس عین المعارف کے نسخے ہیں ان میں میں بھی شامل ہوں تو انہیں اور بھی مسرت ہوئی۔ اس طرح ذاتی تعلقات گہرے ہونے سے پہلے ہم دونوں کے درمیان آسی مرحوم ہی قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے تھے جن سے میرا برادری کا اور منظر صاحب کا بیعت کا رشتہ ہے اور سب سے زیادہ مشترک بات یہ ہے کہ ان کی شاعری سے ہم دونوں ہی بے انتہا متاثر ہیں۔

منظر صاحب نے 'عین المعارف' کے نئے ایڈیشن کی کتابت مجھے اس غرض سے دی کہ میں اس پر ایک نظر ڈال لوں۔ بدقسمتی سے وہ کتابت کچھ ایسے ناتجربہ کار ہاتھوں عمل میں آئی تھی کہ اس میں غلطیاں ناقابلِ اصلاح حد تک موجود تھیں۔ میں نے تو انہیں یہی رائے دی کہ اسی میں ردوبدل کر کے کام چلا لیا جائے لیکن یہ بات منظر صاحب کی خوش ذوقی کے منافی تھی لہٰذا انہوں نے اپنا ہزاروں روپے کا نقصان برداشت کر لیا لیکن اس پوری کتابت کو رد کر دیا اور پھر انہوں نے اس نئے ایڈیشن کی نئے سرے سے کتابت، تصحیح اور طباعت وغیرہ سے متعلق تمام امور میرے سپرد کر دیئے اور میں نے اپنی تمام تر ناتوانی اور ناتجربہ کاری کے باوجود اسے ایک خوش گوار بار سمجھ کر اٹھا لیا۔ اس میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ تو اربابِ علم ہی کریں گے۔

وسط ۱۹۸۷ء میں میرا تبادلہ بحیثیت جوائنٹ سیکریٹری کیبنٹ ڈویژن راولپنڈی ہوگیا۔ تب احساس ہوا کہ کتابت وطباعت جیسے کاموں میں متعلقہ فرد کی غیر موجودگی کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ انہی دنوں کاتب صاحب بھی اپنے ذاتی مسائل کا شکار رہے اور اس طرح تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی جس کے لیے میں منظر صاحب اور ان تمام شائقین سے جنہیں وہ 'عین المعارف' کی طباعت کی اطلاع دے چکے تھے، شرمندہ ہوں۔ تقریباً دس ماہ بعد میرا تبادلہ دوبارہ کراچی کا ہوگیا اور اب خدا کا شکر ہے کہ کسی کسی طرح یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس سلسلہ میں جن لوگوں نے میری مدد کی میں ان سب کا شکر گزار ہوں خصوصاً اپنے سابق رفقار کار جناب کلیم اللہ خاں صاحب اور جناب آفتاب احمد قریشی صاحب (وزارتِ مالیات، کراچی)، کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے پورے خلوص اور محبت کے ساتھ تصحیح اور طباعت کے ہر مرحلہ پر میری مدد کی۔

'عین المعارف' کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا اس کا تعین کرنا مشکل ہے۔ بہرحال قیاس غالب یہی ہے کہ یہ اشاعت جناب آسی کی وفات کے بعد ہوئی۔ خانقاہ رشیدیہ (جونپور) کی تاریخ پر مبنی ایک کتاب "سمات الاخیار" کے آخر میں 'عین المعارف' کے چھپ جانے کی خوش خبری اور کتاب کا اشتہار دیا گیا ہے۔ حضرت آسی کا وصال ۱۳۳۵ھ میں ہوا اور 'سمات الاخیار' ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوئی۔ گویا اسی عرصہ میں کسی وقت اور اشتہار کی عبارت کی بنا پر گمان غالب یہ ہے کہ ۱۳۴۴ھ سے کچھ ہی پہلے 'عین المعارف' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس وقت اس کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپیہ تھی۔

مجھے یا منظر صاحب کو تلاشِ بسیار کے باوجود پہلے ایڈیشن کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ ہمارے پاس 'عین المعارف' کا جو ایڈیشن ہے اس میں کہیں بھی سالِ طباعت کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں اس کے دوسرے ایڈیشن ہونے کی تصریح بھی نہیں ہے لیکن اس کی قیمت ساڑھے چار روپے درج ہونے کی وجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔

'عین المعارف' کے دستیاب ایڈیشن کی کتابت قدیم انداز میں مسلسل کی گئی ہے اور جگہ جگہ نشانات لگاکر حاشیوں میں متبادل الفاظ یا مصرعے لکھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے لیکن قیاس کہتا ہے کہ فاضل مرتب کے پیشِ نظر کلامِ آسی کے ایک سے زیادہ نسخے تھے۔ انہوں نے کسی ایک کو بنیاد بنایا اور دوسرے نسخہ یا نسخوں میں جہاں کہیں انہیں کوئی دوسرا لفظ یا مصرعہ ملا اسے نشان لگاکر حاشیہ میں دے دیا اور کاتب نے بھی جہاں چاہا اسے لکھ دیا۔ زیرِ نظر ایڈیشن میں تمام متبادل الفاظ وغیرہ جدید انداز میں نمبر کی تصریح کے ساتھ ذیلی حاشیوں میں دے دیئے گئے ہیں

گویا قاری کے سامنے بعض اشعار دو طریقوں سے آجائیں گے اور وہ اپنے ذوق کے مطابق ان میں سے خود کسی ایک کا انتخاب کرے گا۔ پچھلے ایڈیشن میں جو اغلاط تھیں انہیں بھی درست کر دیا گیا ہے۔

زیرِ نظر ایڈیشن کی تیاری کے وقت میں نے اپنے محترم دوست ڈاکٹر اسلم فرخی (سابق صدر شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی وحال مشیر انجمن ترقی اردو، کراچی) سے درخواست کی کہ وہ ایک مضمون لکھ کر کلامِ آسی کی خوبیوں کو اجاگر کریں تاکہ اسے بطور تعارف اس کتاب میں شامل کیا جاسکے۔ لیکن انہوں نے بڑی فراخ دلی سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اگرچہ کلامِ آسی پر تعارف لکھنا بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن اسی موضوع پر محترم مجنوں گورکھپوری کا مضمون پہلے سے موجود ہونے کے باعث کسی نئے مضمون کی فی الحال ضرورت نہیں۔ چنانچہ اسلم صاحب ہی کی وساطت سے مجھے محترم مجنوں گورکھپوری کا مضمون اور اسے 'عین المعارف' میں شامل کرنے کی زبانی اجازت ملی جس کے لیے میں اور منظر صاحب ان دونوں حضرات کے شکر گزار ہیں۔

دورانِ مطالعہ کلامِ آسی سے متعلق چند اور حضرات کی موقر آرا بھی نظر سے گزریں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے انہیں بھی 'اقتباسات' کے عنوان سے اس ایڈیشن میں درج کر دیا گیا ہے۔

اب ایک تلمیح کی وضاحت ضروری ہے۔ 'عین المعارف' کی غزل نمبر ۲۹ کی ردیف "محمد ارشدؒ" ہے اور یہ انہی کی منقبت میں کہی گئی ہے۔ یہ بزرگ سنہ ۱۰۴۱ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱۶۷ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ یہ خانقاہ رشیدیہ کے بانی جناب شیخ محمد رشید مرحوم (سنہ ۱۰۰۰ھ تا سنہ ۱۰۸۳ھ) کے فرزند اور سجادہ نشین تھے۔

اس ایڈیشن کی تیاری میں جہاں کہیں کوئی کوتاہی رہ گئی یا کوئی غلطی سرزد ہوئی اس کا اصل سبب میری اپنی کم علمی اور دفتری مصروفیات ہیں۔ امید ہے کہ قارئین عفو و درگذر سے کام لیں گے۔

شاہ محی الحق فاروقی

(ڈائرکٹر، ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان)

کراچی

۲۴ جون ۱۹۸۸ء

نقد و نظر

حضرت آسیؔ کی شاعری

اِس قدر درد سے لبریز جو تقریر نہ ہو
سخنِ آسیؔ شیدا غزلِ میرؔ نہ ہو

میرے مقالے کا موضوع حضرت آسیؔ غازی پوری کی شاعری اور ان کا وہ نرالا اندازِ تغزل ہے جس کی بناء پر خود شاعر کو احساس ہے کہ اس کی شاعری اکثر "غزلِ میرؔ" کے رتبہ کو پہنچ جاتی ہے جیسا کہ اُس نے اپنے شعر میں ظاہر کر دیا ہے۔

دُنیا میں محرومی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ جس چیز کو چاہو وہ نہ ملے۔ دوسری یہ کہ ایک ملی ہوئی دولت کی صحیح اور کماحقہٗ قدر نہ کی جائے۔ اگر ایک طرف ایسوں کی تعداد بے شمار ہے جو عمر بھر اکسیر کی تلاش کرتے رہے اور نہ پا سکے تو دوسری طرف ایسوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کو اکسیر ملنے کو تو بارہا ملی مگر وہ بیشتر اوقات اس کو خاک سمجھتے رہے۔ میں جب آسیؔ غازی پوری کی شاعری پر غور کرتا ہوں اور پھر اس ناشناسی اور بیگانہ وشی کو دیکھتا ہوں جس کو اُردو شاعری کے نقادوں نے ان کے حق میں برتا ہے تو مجھے اِس دوسری ہی قسم کی محرومی کی مثال نظر آتی ہے۔

آج مجھے کوئی قابلِ قدر تاریخِ شعرِ اُردو ایسی یاد نہیں آتی جس میں آسیؔ کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہو۔ مولانا عبدالسلام ندوی جیسا بالغ نظر اور ہمہ گیر مؤرخ دو جلدیں "شعرالہند" کی لکھ ڈالتا ہے اور مشکل سے کسی ایک جگہ آسیؔ کا نام لے کر چپ ہو جاتا ہے اور پھر نہ ان کی شاعری پر کوئی رائے دیتا ہے اور نہ ان کا ایک شعر درج کرتا ہے۔ کیا آسیؔ کے سارے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہ نکل سکا جس کو تغزل یا تصوف یا کسی اور عنوان کے تحت مثالاً پیش کیا جا سکتا؟ کہا جا سکتا ہے کہ آسیؔ کا مرتبہ شاعر سے بہت بلند تھا اور شاعری ان کے لیے باعثِ فخر نہ تھی۔ وہ خانقاہِ رشیدیہ کے سجادہ نشین تھے اور ایک صاحبِ باطن مرشد اور یہی اُن کی اصل بزرگی اور برگزیدگی ہے جس کے سامنے ان کی ساری شاعری شرما کر مُنہ چھُپا لیتی ہے۔ یہ آسیؔ خود کہتے تو ہم خاموش ہو جاتے یا پھر اگر کوئی ایسا مرید کہتا جو شاعری کا مبصر نہ ہوتا یا کم از کم شاعری پر تنقید کرنے نہ بیٹھا ہوتا تو بھی اس کو معاف کیا جا سکتا تھا لیکن ایک نقادِ ادب کو ایسا تجاہل زیبا نہیں۔ اُردو شاعری میں آسیؔ کی شاعری کو شامل نہ کرنا صریح ظلم ہے۔ مانا کہ آسیؔ کے لیے شاعری ننگ تھی لیکن ہمارے لیے تو ننگ نہیں ہے اور پھر آسیؔ کے کلام میں جو سنجیدہ دردمندی اور جو متین گداز ہے وہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود بھی مزہ لے کر شعر کہتے تھے اور شاعری کو ننگ و عار

کی چیز نہیں سمجھتے تھے۔

سب سے پہلے میں ان کی مشہور غزل کے دو شعر لیتا ہوں اور انہیں سے اس تبصرہ کا افتتاح کرتا ہوں۔ مطلع ہے۔

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے ؛ بلبلہ ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے

یہ شعر اگر سوچئے تو شعورِ محبت کی ایک خاص منزل کا پتہ دیتا ہے جو تصوّف کے انفعالی سکون سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ نفسانیت کے اضطراری ہیجان سے۔ شاعر کو وصل اس وقت میسّر ہوتا ہے جبکہ وہ ایک پوری عمر وصل کی تمنا میں کھو چکا ہے اور اس کی ایک خاص طبیعت بن چکی ہے۔ مہجوری کا غم سہتے سہتے اس کے اندر ایک ذوقِ غم پیدا ہو گیا ہے یعنی اب غم اس کا مزاج ہے اور اب اس کو وصل نصیب ہوتا ہے جبکہ وہ وصل سے لذت اندوز ہونے کی پوری صلاحیت نہیں رکھتا۔ نتیجہ ایک عبرت ناک کش مکش CONFLICT ہے جس کو ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا۔ ایک طرف تو وصل کی نشاط انگیزیاں ہیں دوسری طرف اس ذوقِ غم کا جواب بمنزلۂ فطرت ہے۔ مطالبہ یہ ہے کہ کسی چیز سے نشاط نہ حاصل کرو۔ اس کش مکش کو شاعر صرف لفظ 'پیچیدہ' سے ادا کرتا ہے۔ اب آپ اس لفظ کی بلاغت کا اندازہ کیجئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے لکھنؤ کے ایک دوست نے جو اردو تنقید نگاری میں کافی روشناس ہو چکے ہیں۔ ایک مرتبہ اسی شعر کو پڑھ کر اعتراض کے لہجہ میں پوچھا تھا 'آخر اس "ذوقِ پیچیدہ" کے کیا معنی ہیں؟' میں نے اُن کو بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ کہہ نہیں سکتا کہ وہ سمجھ سکے یا نہیں مگر چپ ضرور ہو گئے۔ خیر اب دوسرے مصرع کی طرف آیئے۔ تشبیہات اور استعارات کی دنیا کا پورا جائزہ لے چکنے کے بعد بھی اس خاص حالت کی مصوّری کے لیے اس سے زیادہ صحیح تشبیہ خیال میں نہیں آتی۔ تشبیہ یا استعارہ جب تک جامع اور مانع نہ ہو فنی اعتبار سے ہم اس کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ یہ بلبلہ کی تشبیہ جس طرح ہماری اس مخصوص حالت پر محیط ہو گئی ہے شاید کوئی دوسری تشبیہ نہ ہو سکتی۔

یہ کش مکش کوئی ایسی دنیا سے نرالی بات نہیں جو ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن عام انسان یا تو اس منزل تک پہنچنے کی تاب نہیں لاتا یا اگر پہنچ جاتا ہے تو عموماً اپنی حالت سے بے خبر رہتا ہے۔ شاعر کا کام ہمارے اندر آگاہی پیدا کرنا ہے۔ شاعر اور صوفی میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ صوفی کے لیے اس کے اپنے واردات اور تجربات ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور وہ انہیں میں کھویا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے شاعر اپنے واردات اور تجربات کو اس وقت تک قابلِ قدر نہیں سمجھتا جب تک کہ وہ ان کو از سرِ نو پیدا کر کے دوسروں کے مطلب کی چیز نہ بنا دے۔ صوفی جب خبردار ہوتا ہے تو پھر ہم کو خود اس کی خبر نہیں لگتی۔ شاعر جب خبردار ہوتا ہے تو وہ دوسروں کو بھی خبردار کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ آسیؔ کے شعر کا یہی

اثر ہوتا ہے کہ ہم خود اپنی واقعی یا امکانی حالت سے آگاہ ہو کر اس پر عبور پا جاتے ہیں۔

میں نے سب سے پہلے اس شعر کو اس لیے منتخب کیا کہ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود شاعر کس منزل پر ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں نہ محض صوفی پہنچ سکتا ہے نہ محض شاعر بلکہ صرف وہ شخص پہنچ سکتا ہے جو صوفی اور شاعر دونوں ہو اور جس نے تصوف اور شاعری کو ملا کر ایک آہنگ بنا لیا ہو۔ آسی مجھے مجاز اور حقیقت کا ایک نہایت خوشگوار تصفیہ معلوم ہوتے ہیں ان کی شاعری اس سطح سے ہوتی ہے جہاں مجاز حقیقت اور حقیقت مجاز ہے۔ خود شاعر اپنے اندر اس کا احساس پاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

دنیا میں اٹھا لائے گی فردوسِ بریں کو
بدمستیِ صہبا و مزامیر ہماری

یہی وجہ ہے کہ آسی کے حال میں قال کا مزہ ہوتا ہے اور ان کے قال میں حال کا کیف۔ ان کی شاعری کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار کو ہر سطح کا آدمی حسبِ توفیق دل نشین پاتا ہے اور ان سے کیف اندوز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اب وہ دوسرا شعر لیجئے جو اسی غزل کا مقطع ہے جس کے پہلے شعر سے میں نے ابتدا کی تھی۔

حشر میں مُنہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسیؔ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

مجاز میں حقیقت کو دیکھنا ایک بہت پُرانی سی رسم ہو گئی ہے۔ یہ کہنے والے دنیا میں بہت ملیں گے:

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے اِک تو ہی صاحب خانہ تھا

لیکن حقیقت کو مجاز کی نت نئی رنگینیوں سے معمور اور پُرکیف پانے کے لیے ایک خاص بصیرت درکار ہے مجاز میں حقیقت کا نظر آنا تو پھر بھی دونوں میں ایک محسوس فرق کو باقی رکھتا ہے لیکن حقیقت میں مجاز دیکھنا دراصل دونوں کو ایک محسوس کرنا ہے۔ آسی نے اپنے شعر میں یہی کیا ہے، پڑھتے ہی ہر مدرس کہہ دے گا کہ شعر میں حشر، داورِ حشر اور اپنی گنہگاریوں کا ایک مرقع پیش کیا گیا ہے لیکن شعر کو جو چیز اسی قبیل کے اور سیکڑوں اشعار سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی بلیغ مجازیت SYMBOLISM یا تمثیلیت ALLEGORISM ہے اور اسی نے اس کو ہر شخص کے حالات اور جذبات سے قریب اور مانوس رکھا ہے۔ شاعر نے عارفانہ وجدانات کو عاشقانہ واردات بنا دیا ہے اور اس کو اپنی اپنی توفیق اور اپنی اپنی بصیرت پر

چھوڑ دیا ہے کہ داورِ حشر کو جو جی چاہے سمجھ لو۔ ہمارے لیے اس کی بھی پوری گنجائش کہ ہم اس ہستی کو جزا اور سزا کا مالک سمجھیں جو اس زندگی میں ہمارے دل کا مدعا رہ چکی ہو اور جس نے اس دنیا میں ہماری تمنّا کی گستاخیوں اور بے باکیوں کو کبھی نہ بخشا ہے۔ ریاضؔ مرحوم کا ایک شعر ہے۔

رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا
وہی جلوہ آرائے محشر نہ نکلے

ریاضؔ کے تخیل میں جو بات گمان و تذبذب رہ گئی تھی وہ آسیؔ کے مشاہدہ میں آگئی ہے۔ اور عین الیقین ہو گئی ہے۔ داورِ حشر سے ہم کوئی اجنبیت نہیں محسوس کرتے اس لیے کہ وہ تو ہمارا وہی قدیم محبوب ہے جو اپنی تمام بے وفائیوں کے باوجود زندگی میں ہمارے سارے حرکات و سکنات کا کارفرما رہ چکا ہے۔ اگر آسیؔ فطرتاً شاعر نہ ہوتے اگر وہ محض ایک عارفِ کامل ہوتے تو ایک ایسے تصورِ مجرد کی اتنی کامیاب مصوری نہ کر سکتے کہ ہر شخص کو وہ ایک ایسا امکان معلوم ہونے لگے جس کو واقعہ کی صورت اختیار کرتے دیر نہیں لگتی۔ اسی غزل کے البعض اور اشعار سُننے کے لائق ہیں۔

آنکھیں تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں دل ترا گرویدہ ہے
جلوہ تیرا دیدہ ہے صورت تری نادیدہ ہے[1]

انگریزی کے مشہور نقاد ہیزلٹ HAZLITT نے سچ کہا ہے کہ "شاعری تخیل اور جذبات کی زبان ہوتی ہے"۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر منطق یا ریاضیات کو بھی اس زبان میں پیش کیا جائے تو وہ شاعری ہو جائے۔ شاعری اور منطق میں سوا اس کے اور کوئی فرق نہیں کہ منطق کی زبان اور اس کے تصورات جذبات و تخیل سے یک قلم عاری ہوتے ہیں۔ بہرکیف ذرا آسیؔ کے اس 'تجھ کو' کو ملاحظہ کیجئے جس کو ان کی آنکھیں ڈھونڈھتی رہتی ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ صوفیوں کا وہی پرانا رسمی معشوق ہو گا جس کو شاہدِ ازل کہتے ہیں لیکن آسیؔ کے اندازِ تخاطب نیں جو بے تکلفی۔ جو والہانہ سادگی اور جو عاشقانہ وارفتگی پائی جاتی ہے اس نے اس شاہدِ ازل کو ہر شخص کا محبوب بنا دیا ہے اور ہم آپ سب محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہماری زندگی میں ایسے تخاطب اور تکلم کا موقع بارہا آچکا ہے۔

دوسرا شعر خالص تصوّف اور معرفت کا ہے لیکن اس میں بھی مجاز کی پوری رنگینیاں موجود ہیں اور اس بُت پرستی کی لاج رکھ لی گئی ہے جو انسان کی فطرتِ اصلی ہے۔

اتنے بت خانوں میں بندے ایک کعبہ کے عوض
کفر تو اسلام سے بڑھ کر تیرا گرویدہ ہے

---

[1] عین المعارف میں یہ شعر موجود نہیں (فاروقی)

یہ اس غزل کے اشعار تھے جس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو اُردو شاعری کا صحیح مذاق رکھتا ہے۔ اب قبل اس کے کہ ہم آسیؔ کے اور اشعار کی طرف متوجہ ہوں ان کے متعلق چند اہم رسمی باتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔

آسیؔ کا سلسلۂ تلمذ ناسخؔ سے ملتا ہے اور جہاں تک شاعری کے اسالیب وصُوَر کا تعلق ہے وہ لکھنوی دبستان کے تربیت یافتہ ہیں چنانچہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کو آج کل کے روشن خیال نقاد محض اُردو شاعری کے مزخرفات کہہ کر الگ کر دیں گے اور جن میں سوائے مناسبات و رعایات کے اور کچھ نہیں ہے اور اس سے انکار نہیں کہ یہ اشعار صرف زمین اور ردیف و قافیہ بنانے کے لیے کہے گئے ہیں۔ یہ اشعار کچھ شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، ناسخؔ اور رشکؔ ہی کو زیب دے سکتے تھے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

کہا یہ دیکھ کر خالِ بُتِ بے پیر کا دانا
الٰہی اس کو تو کرنا مری تقدیر کا دانا
جو دانا ہے تو دیوانوں کے قدموں سے تو لپٹا رہ
مسلسل یہ صدا دیتا ہے ہر زنجیر کا دانا

گلوے خشک خواہاں ہے دمِ تکبیر پانی کا
ذبیحہ سے نہ کر بخل اے دمِ شمشیر پانی کا
خدنگِ آہ نکلا یا کلیجہ ہو گیا پانی
ہوائے تیر سُنتے تھے یہ دیکھا تیر پانی کا

آہ بھی آج ہوئی ہم سفرِ اشک نئی
کیا ملی سوئے فلک رہ گذرِ اشک نئی
آج تو گریۂ عاشق نے کئے دل ٹکڑے
ہاتھ آئے کوئی تیغِ اثرِ اشک نئی
کوششِ دستِ مژہ نے اسے کب روکا تھا
آج ہے طرزِ گرفتِ کمرِ اشک نئی

اس انداز کے اشعار دیوانِ آسیؔ میں کم نہیں ہیں مگر یہ ان کی شاعری نہیں ہے بلکہ صرف

مشق و ریاضت ہے جس طرح وہ خانقاہ رشیدیہ کی سجادہ نشینی اور اس کے تمام رسوم و روایات کی پابندی کو اپنی روح کی تہذیب و تحسین کے لیے ضروری سمجھتے تھے اسی طرح انہوں نے اپنے مدرسۂ شاعری کے تمام شرائط و لوازم کو پورا کرنا شاعری کی تکمیل کے لیے اپنا نصاب بنا لیا تھا۔ آسیؔ کے مریدین اُن اشعار کو جو ابھی سنائے گئے ہیں آسیؔ کی ابتدائی مشق بتاتے ہیں اور یہ بہت بڑی حد تک صحیح ہے لیکن ان کی حقیقت صرف اسی قدر نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ دراصل ان بندشوں اور ضابطوں کی یادگاریں ہیں جس سے آسیؔ نے اپنے نفسِ شعری کی تربیت کی ہے۔

آسیؔ نے زبان، تشبیہات و استعارات اور دیگر رعایات وہی استعمال کئے ہیں جو روزِ اوّل سے ہمارے قدیم شعرا استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن انہوں نے ان روایاتِ قدیمہ میں جو نئی جان ڈالی ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ جو تاثیر آسیؔ نے اپنے کلام میں ان رسوم و تکلفات سے پیدا کی ہے وہ انتہائے خلوص و سادگی کے باوجود بھی کسی دوسرے کو مشکل ہی سے میسّر ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ آسیؔ دبستانِ ناسخؔ کے میرؔ ہیں۔ خود ان کو بھی اس کا احساس ہے مگر آخر اس تاثیر کا راز کیا ہے؟ آسیؔ کی باتیں اس قدر درد سے لبریز کیوں ہوتی ہیں اور وہ ہم پر چھا کیوں جاتی ہیں؟

آسیؔ کو یہ راز معلوم تھا کہ حقیقت کبھی عُریاں منظرِ عام پر نہیں لائی جا سکتی۔ حقیقت سے میری مراد محض معرفتِ خداوندی نہیں ہے بلکہ ہر وہ حالت ہے جو ہم پر گزرے۔ بہرحال آسیؔ نے تشبیہات اور استعارات اور دیگر صنائع و بدائع سے وہی کام لیا ہے جو اہلِ معرفت رموز و علامات سے لیتے ہیں۔ وہ ہر کیفیت اور ہر تاثر کو اس قدر آراستہ و پیراستہ کر کے سامنے لاتے ہیں کہ ظاہر پرست ان کو محض خرافاتِ شاعری سمجھتے ہیں لیکن اہلِ بینش کے دلوں پر بن جاتی ہے اس لیے کہ وہ دیکھ لیتے ہیں کہ شاعر دراصل کس حال میں ہے اور اس بناؤ و سنگار سے اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

آسیؔ کے لیے یہ تمام رموز و کنایات، یہ سارے تشبیہات و استعارات زندہ حقیقتیں ہیں۔ میں یہاں ایک شعر سے اپنا مطلب واضح کرنا چاہتا ہوں اور وہ آسیؔ کے جاننے والوں میں کافی مشہور شعر ہے۔

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
مُنہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

ایسوں کی تعداد کافی ہے جو شعر سُنتے ہی یہ کہہ دیں گے "میاں اس شعر میں رکھا ہی کیا ہے، وہی قیامت کا ذکر۔ وہی تابِ دیدار کا رونا۔ وہی دقیانوسیت"۔ میں اس لیے یہ کہنے کی جرأت

کر رہا ہوں کہ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں جب کہ یومِ حالیؔ کے سلسلے میں میں پانی پت جا رہا تھا تو اپنے چند ہم سفر احباب سے اس شعر پر اس قسم کی رائے سُنی تھی۔ مجھے بھی اتفاق ہے کہ ہاں سب باتیں وہی ہیں قیامت بھی وہی۔ تابِ دیدار بھی وہی۔ لیکن وہی دقیانوسیت کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ شاعر اچھی طرح جانتا ہے کہ دیدار کی تاب لانا دنیا میں سب سے زیادہ سخت اور دشوار کام ہے۔ ذرا ہم آپ سب اپنی اپنی زندگی پر تبصرہ کر جائیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جن کو اس دیدار سے سابقہ پڑا ہے اور جو اس کی تاب لا سکے ہیں؟ وہ قیسؔ و فرہادؔ ہوں یا کلیمؔ و منصورؔ اپنی تنگ ظرفی اور بے تابی کی بدولت محبوب کے جلوؤں کے سامنے شرمندہ سبھی کو ہونا پڑتا ہے۔ یہ شرمندگی انسان کا مقدر معلوم ہوتی ہے۔ آسیؔ کی لغت میں قیامت نام ہے دوسرے روزِ دیدار کا۔ ان کے لیے قیامت کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ محبوب سے دوبارہ مگر آخری بار مُلاقات ہوگی۔ یہ محض خیال نہیں ہے بلکہ آسیؔ کا ایمان ہے۔ حشر کی غایت سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ محبوب کا دیدار نصیب ہو۔ اب ذرا سوچئے کہ ایک عاشقِ نامراد جو زندگی میں اپنی تابِ نظارہ سے دھوکا کھا چکا ہو اور صرف اپنے ظرف کے بدولت جلوۂ یار سے محروم رہ گیا ہو اور جس کو ابھی یہ اندیشہ لگا ہو کہ کہیں پھر ایسا ہی نہ ہو سوائے اس کے اور کیا دُعا مانگ سکتا ہے کہ ؏

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا

اور یہ دعا کچھ عجیب قسم کا خلوص اپنے اندر رکھتی ہے جس کا اثر زبان تک میں موجود ہے۔ پیرایۂ اظہار میں جو گداختگی اور جو گھلاوٹ پائی جاتی ہے اس سے غیر شعوری طور پر سُننے والے کو اپنی گزری ہوئی حالت یاد آجاتی ہے اور وہ بے اختیار دعا میں آسیؔ کا ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ سُنتے ہیں لبِ اظہار کا یہ معجزہ کبھی مسیحا کو ملا تھا۔

آسیؔ نے قیامت کے پامال تصوّر میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔ ان کے دیوان میں قیامت کا بار بار ذکر آتا ہے اور جب ذکر آتا ہے تو مخصوص تصور اور مخصوص اعتقاد کے ساتھ۔ قیامت اس دن کا نام ہے جب کہ اس کار و بارِ عاشقی کی تکمیل ہوگی جو اس زندگی میں نامکمل رہ جاتا ہے اس کو نفسیات کی اصطلاح میں ان داعیات و میلانات کی تکمیل کہتے ہیں جو چند در چند اسباب و عوارض کی وجہ سے ہماری روزمرہ کی زندگی میں پورے نہیں ہونے پاتے۔ ہماری ان خون گشتہ حسرتوں اور رد کردہ تمناؤں کی تکمیل ہمیشہ پردے میں ہوتی ہے۔ ہمارے خواب اس تکمیلِ آرزو کی ایک خاص صورت ہیں۔ خواب میں ہمارا نفس آزاد و خود مختار ہوتا ہے اور محال سے محال آرزو کو آسودہ کر سکتا ہے۔ آسیؔ قیامت اور خواب دونوں کو ایک ہی عنوان کی چیزیں سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں اور کس یقین کے ساتھ کہتے ہیں:

میری آنکھیں اور دیدار آپ کا
یا قیامت آگئی یا خواب ہے

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں:

رو کے آسیؔ پوچھتا تھا کب قیامت آئے گی

کس طرح کہیے کہ وہ تیرا تمنائی نہ تھا

تمنا اور انتظار کا اس سے زیادہ شدید اور بلیغ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے اور پھر قیامت کا اس سے زیادہ متعین اور واضح تصور کہاں ملے گا؟ کبھی کبھی آسیؔ کا یقین متزلزل بھی ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن کی کامیابی کی طرف سے بھی وہ کچھ بدگمان اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اس شعر میں:

وہ کاش اتنا قیامت میں تو پوچھیں

کہاں ہے آسیِ بے دل ہمارا

یا یہ شعر:

وہاں بھی وعدۂ دیدار اس طرح ٹالا

کہ خاص لوگ طلب ہوں گے بارِ عام کے بعد

مگر اساسی تصور وہی ہے یعنی قیامت اور دیدار کے درمیان ایک ازلی نسبت ہے اور قیامت تو بہت بعد کی چیز ہے۔ آسیؔ اس سے ایک منزل پہلے شبِ گور کو بھی ملاقات کی رات سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسیؔ

ہے شبِ گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

موت اور بعد الموت کے متعلق آسیؔ کے علاوہ اگر کسی کو ایسا یقین اور اطمینان نصیب تھا تو وہ سقراط ہی تھا۔ اور اگر آسیؔ کا یہ یقین پورا نہ ہوا تو قیامت سے بھی کچھ حاصل نہیں۔

نظر و ناظر و منظور نہ جب ایک ہوئے

کیا ملا روزِ قیامت میں ندامت کے سوا

پھر قیامت میں وہی ندامت ہوگی جو ایک بار زندگی میں ہو چکی ہے۔ آسیؔ زندگی کو ایک طویل میعادِ انتظار و امید قرار دیتے ہیں جو قیامت کے دن پوری ہوگی۔ چنانچہ کہتے ہیں:

کچھ ہمیں سمجھیں گے یا روزِ قیامت والے

جس طرح کٹتی ہے امیدِ ملاقات کی رات

اور اس شعر میں تو نہایت لطیف اور بلیغ کنایہ میں واضح کر دیا ہے کہ بچھڑے ہوئے محبوب سے ملنا اب قیامت ہی میں ہوگا۔

الٰہی آسیؔ بے تاب کس سے چھوٹا ہے
کہ خط میں روزِ قیامت لکھا ہے نام کے بعد
اگر قیامت یہی ہے تو اس کو عشاق کی عید سمجھئے۔

قیامت کی اصل غایت تو جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے یہی ہے کہ محبوب کی ملاقات میسّر ہو لیکن اس کا بھی اندیشہ ہے کہ ہم مایوس و ناکام رہ جائیں اور قیامت کے دن بھی کچھ نہ ہو سکے اس لیے کہ اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی تاب کی شرط لگی ہوئی ہے ممکن ہے کہ عین وقت پر ہمارا ظرف پھر ہمارے ساتھ کمی کر جائے۔ اس خیال سے آسیؔ کا دل کانپ اُٹھتا ہے۔ ایک رُباعی میں کہتے ہیں۔

پھر بادۂ تندِ غصّہ پینا ہو گا
پھر ٹکڑے جگر کے ساتھ سینا ہو گا
جینے نے یہاں کے مار ڈالا آسیؔ
سُنتے ہیں کہ پھر حشر میں جینا ہو گا

بے ساختہ اس جگہ یقینؔ کا ایک شعر یاد آ گیا۔

دوبارہ زندگی کرنا مصیبت اس کو کہتے ہیں
پھر اُٹھنا بے دماغوں کا قیامت اس کو کہتے ہیں

لیکن یقینؔ اور آسیؔ میں وہی فرق ہے جو شوریدگی اور پختہ مغزی میں ہوا کرتا ہے بہرحال قیامت کے دن اور کچھ ہو یا نہ ہو اتنا تو ہونا ہی ہے کہ ہماری زندگی کا قضیہ جہاں سے چھوٹا تھا وہیں سے پھر شروع ہو گا۔

خبر جو محشر میں بھیڑ کی ہے وہ حسرتوں کا ہجوم ہو گا
وہ داغ ہو گا کسی کے دل کا جو چمکے گا آفتاب ہو کر

اور حسرتوں کا یہ ہجوم زیادہ تر ہمارے جذبۂ عشق کی نیابت کرے گا اس لیے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی میں جو جذبہ سب سے زیادہ نامکمل اور ناآسودہ رہ جاتا ہے وہ ہمارا جذبۂ عشق ہی ہوتا ہے۔ ہماری جو تخیّل سب سے زیادہ ناقص رہ جاتی ہے وہ محبّت کی تخیّل ہے اور ہم مجبوراً اس کو قیامت کے دن کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

دورِ جدید کی مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا ایسے خیالات کی فرسودگی پر قہقہہ لگاتی ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ کسی چیز کی فرسودگی اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہوا کرتی حقیقت جتنی ہی زیادہ پرانی ہو گی اتنی ہی زیادہ سنگین بھی ہو گی۔ حشر و معاد کا تصوّر انسان کی فطرت میں ہے۔ دنیا میں جتنے مذاہب

ظہور پذیر ہوئے، ان سب کی بنیاد اسی سوال پر رہی ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ مومن ہو یا منکر، ملحد ہو یا صوفی، دہریہ ہو یا متکلم اگر وہ اپنے نفس کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لے تو معلوم ہوگا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے اندر یہ اندیشہ موجود ہے کہ جس زندگی کی ابتدا یوں ہوئی اور جو یوں ناکمل رہ گئی اس کا موت کے بعد کیا حشر ہوگا۔ ظاہر پرست یورپ جو مادیت اور افادیت کا مبلغ اور علم بردار سمجھا جاتا ہے آج دنیا میں ہر ملک سے زیادہ اس سوال کی طرف متوجہ نظر آتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ آج یورپ میں جن علوم کا سب سے زیادہ چرچا ہے وہ تحلیلِ نفسی اور تحقیقِ روحانی ہیں۔ اور یہ دونوں اس باب میں متفق ہیں کہ مرنے کے بعد ہمارے وہ میلانات و داعیات ابھریں گے جو اس زندگی میں دب کر رہ گئے اور جو علی الاعلان آسودہ نہ کئے جا سکے۔ یہ بھی سب مانتے ہیں کہ ان میلانات میں سب سے زیادہ اہم اور ناقابلِ تردید وہ ہیں جن کا تعلق ہمارے جذبۂ زوجی یا شعورِ جنسی سے ہے۔ وہ اس کو شعورِ جنسی کہتے ہیں۔ ہم اس کو زیادہ لطیف اور پُرکیف پاتے ہیں اور عشق کہتے ہیں بہرحال یہ مسلّم ہے کہ ہمارے وہ جذبات ہماری روح سے لپٹے رہیں گے جو دنیا میں خاطر خواہ آسودہ نہ ہو سکے پھر اگر آسیؔ یہ کہتے ہیں تو کیا غلط ہے۔

غبار ہو کے بھی آسیؔ پھرو گے آوارا
جنونِ عشق سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا

آج کل حیاتِ انسانی کا سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہی ہے اور شاید ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک ایسا ہی رہا ہے۔ اب ہم آسیؔ کے دو چار اور اشعار ایسے سناتے ہیں جن کا موضوع موت اور قیامت ہے اور جو ہمارے خیال کی مزید تشریح و توثیق کرتے ہیں:

فتنہ زارِ حشر سب سمجھے ہیں جس میدان کو
دامنِ نازِ نگہ کا گوشۂ جنبیدہ ہے

ہم سے بے کل سے وعدۂ فردا
بات کرتے ہو تم قیامت کی

اے شبِ گور وہ بے تابیِ شب ہائے فراق
آج آرام سے سونا مری تقدیر میں تھا

مآل اس کا قیامت ہے قیامت
وہ آفت کی جگہ ہے دارِ فانی

اب تو دیدار دکھا دیجئے تقصیر معاف
ہو گیا وعدۂ فردا ہی قیامت مجھ کو

ساتھ چھوڑا سفرِ ملکِ عدم میں سب نے
لپٹی جاتی ہے مگر حسرتِ دیدار ہنوز

آپ کہتے ہوں گے کہ ہم نے صرف ایک عنوان یعنی قیامت پر اتنا وقت لے لیا۔ مجھے خود اس کا اعتراف ہے لیکن میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ آسی کی ذات اور ان کی شاعری کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ ان کے چند مخصوص اور متعین تصورات و اعتقادات ہیں جن میں آسی کو اسی قدر غلو اور انہماک ہے جس قدر کسی کٹّر سے کٹّر مذہبی شخص کو اپنے مذہب میں ہو سکتا ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آسی قیامت کا ذکر محض شاعری کی رسم ادا کرنے کے لیے نہیں کرتے۔ ان کے ذہن میں قیامت کا ایک خاص تصوّر ہے اور وہ اس کی بابت ایک اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہی آسی کی ساری شاعری ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اور جب کہتے ہیں ایک خاص تصور کے ماتحت اور ایک شدید اعتقاد کے ساتھ کہتے ہیں جس میں ان کو انہماک ہوتا ہے۔ مثلاً

دل دیا جس نے کسی کو وہ ہوا صاحبِ دل
ہاتھ آجاتی ہے کھو دینے سے دولت دل کی

یا مثلاً یہ شعر:

کوئے محبوب سے کوئی بھی نکل سکتا ہے
اپنے اوہام ہوئے وادیِ غربت مجھ کو

شعر میں تشبیہ سے کام لیا گیا ہے اور تشبیہ بھی ایسی جس کو انوکھی کہنا پڑتا ہے۔ مگر یہ آسی کے تخیل کی شدید ہویت جس نے تشبیہ کو عین واقعہ بنا دیا ہے اور مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ "اوہام" کو "وادیِ غربت" بتانا۔ اگر کوئی اور کہتا تو ہم اس کو محض شاعری یعنی ایک دور از کار خیال سمجھتے لیکن آسی کا خلوص جذب اور زبان و دل کی یک آہنگی ہے جس نے اس نرالے تخیل کو ہمارے لیے اقلیدس کا ایک ایسا مقالہ بنا دیا ہے جو کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے۔ ہم سب سُنتے ہی مان لیتے ہیں کہ ہمارے "اوہام" ہی ہمارے لیے "وادیِ غربت" بنے۔ اُردو میں اس قبیل کا صرف ایک شعر مجھے یاد ہے جو میر کے مشہور اشعار میں سے ہے۔

عمر بھر کوچۂ دل دار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا

آسیؔ نے ہم کو اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ ہمارے "اوہام" ہم کو کوچۂ دل دار سے نکال بھی سکتے ہیں اور "اس کی دیوار کا سایہ" ہمارے سر سے جا بھی سکتا ہے۔

آسیؔ رمز و کنایہ کے قائل ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ "دشنہ و خنجر" یا "بادہ و ساغر" کے بغیر گفتگو میں کام نہیں چلتا۔ وہ تشبیہ و استعارہ کو بیانِ حقیقت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں یہ کہنا شاید زبردستی نہ ہو کہ آسیؔ مجاز کو "قنطرۃ الحقیقت" نہیں بلکہ عین حقیقت مانتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی شاعری میں، جو کافی حد تک تشبیہ و استعارہ اور رمز و کنایہ کی شاعری ہے، اتنی تاثیر اور لذت نہ ہوتی کہ اس پر "غزلِ میرؔ" کا اطلاق ہو سکے۔

آسیؔ کے کلام کی مجموعی خصوصیت گسستگی اور تبتل ہے یعنی سب کچھ چھوڑ کر محبوب کی طرف نہ صرف آجاؤ بلکہ اسی میں محو ہو جاؤ۔ لیکن یہ محویت کوئی مجہولی کیفیت نہیں ہے۔ آسیؔ کے وہاں عشق ایک جداگانہ مذہب ہو گیا ہے۔ اور ان کی شاعری کو اس مذہب کی انجیل سمجھنا چاہیے۔ وہ عشق کی بشارت لے کر آئے ہیں اور ان کا پیغام یہ ہے کہ بے عشق زندگی بے کیف ہے۔ ایک شعر میں لکھتے ہیں:

عین معنی ہے وہ دل عاشقِ معنی جو ہوا
ہائے وہ لوگ جو دل دادۂ صورت بھی نہیں

بے ساختہ حافظؔ کا یہ شعر یاد آ گیا۔

بروز حشر ندانم چہ عذر خواہی گفت
کسے کہ دوست ندارد جمالِ زیبا را

آسیؔ نے عشق کو محض ایک وجودِ بے کیف یا انفعالیت نہیں سمجھا ہے۔ عشق نام ہے محبوب میں جذب ہو کر یکسر حرکت و اضطراب ہو جانے کا اور یہ حرکت و اضطراب کوئی عصبی ہیجان نہیں ہے۔ عشق سے مراد وہ مستقل اور پیہم سعی و عمل ہے جس کا تعلق بیک وقت جسم، دل، دماغ، روح، غرضکہ انسان کی ساری ہستی سے ہے۔ عشق اور حسن دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ دونوں کو مل کر انسان کے مقدر کی تحسین و تکمیل کرنا ہے اس لیے عشق مجہولیت اور بے کیفی سے اسی قدر دور ہے جس قدر کہ حسن، حسن اور عشق ایک دوسرے کو کبھی مردہ نہیں ہونے دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر ذوقِ عمل اور نشاطِ کار پیدا کیے رہتے ہیں۔ یہ تین شعر سنیے اور آسیؔ کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

ذوق افزائے جنوں ہے اشتیاق ہم مجھے
دل مرا درکار اُس کو اور اُس کا غم مجھے
میں وہی سمجھا ملی جب کسوتِ آدم مجھے
عالمِ غم میں بنایا مرکزِ عالم مجھے
واقعی صہبائے ذوقِ جلوہ ہستی سوز ہے
وجد میں لاتی ہے آسیؔ حالتِ شبنم مجھے

ذرا اس نویدِ کامرانی کو بھی سُنئے:

ہَوا کے رُخ تو ذرا آ کے بیٹھ جا اے قیس
نسیمِ صبح نے چھیڑا ہے زلفِ لیلیٰ کو

آسیؔ کے دل میں جو دائمی کیف ونشاط موجود ہے اس کا فیض یہ ہے کہ حسن وعشق کے بازار کو کبھی سرد نہیں پاتے۔

حُسن کی کم نہ ہوئی گرمیِ بازار ہنوز
نقدِ جاں تک لیے پھرتے ہیں خریدار ہنوز

آسیؔ عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کی بحث میں نہیں پڑتے۔ عشق بہرحال عشق ہے جس میں "دردِ سر" نہیں بلکہ "دردِ دل" اور "دردِ جگر" درکار ہوتا ہے۔ یہ عشق آخر ہو کس کے ساتھ؟ یہ اپنے اپنے حوصلہ اور اپنی اپنی توفیق پر منحصر ہے۔ بلجیئم کے مشہور صوفی تمثیل نگار مارس ماھترلنک کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس نے عشق کیا ہو اور عشق سے اپنی رُوح کی عظمت اور برگزیدگی میں اضافہ نہ کیا ہو۔ چاہے اس کا عشق کتنا ہی سفلی کیوں نہ ہو۔ آسیؔ نے کھُلے الفاظ میں کہیں یہ تلقین نہیں کی ہے۔ مگر ان کی شاعری کا عام لہجہ اور عام اشارہ یہی ہے کہ عشق مقصود بالذّات ہے جو تمام اضافتوں سے بالاتر ہے جو کسی کے ساتھ منسوب ہو سکتا ہے۔ جب تک عشق عشق ہے ہم کو یہ سوال نہ اٹھانا چاہیے کہ کس کے ساتھ ہے۔

مردم از عشق مرادِ دوجہاں می جستند
صائبؔ از عشق ہماں عشق تمنّا می کرد

یہی وجہ ہے کہ ہر پڑھنے والا عام اس سے کہ وہ شعورِ محبت کی کس منزل پر ہے آسیؔ کی شاعری کو اپنے سے بہت قریب پاتا ہے اور اس کو ماننا پڑتا ہے۔

آسیِؔ مست کا کلام سنو
وعظ کیا پند کیا نصیحت کیا

مشرق کے صوفی شاعروں میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جنہوں نے مجاز کی حقیقت اور قدسیت کو کما حقہ، تسلیم کیا ہے اور جن کے مسلک کو "مجازیت" کہا جا سکتا ہے۔ ایک تو حافظ۔ دوسرے آسیؔ۔ دردؔ کے تصوف کی دھوم محض تاریخ شعر اُردو کی ایک رسم ہے۔ وہ خود کتنے ہی زبردست صوفی کیوں نہ رہے ہوں لیکن شاعری میں ان کا شعورِ عشق بہت ادنیٰ سطح پر ہے اور وہ معاملۂ عشق میں محض ایک نوآموز معلوم ہوتے ہیں۔ آتشؔ میں تصوف اور تغزل دونوں کے قوی اور شدید امکانات موجود تھے لیکن زمانہ اور ماحول نے نہ تو ان کے تصوف کو اچھی طرح نمایاں ہونے دیا نہ تغزل کو۔ آسیؔ کے وہاں تصوف اور تغزل حقیقت اور مجاز دونوں ایک مزاج ہو کر نمایاں ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت والے اس کو حقیقت سمجھتے ہیں اور مجاز والے مجاز۔ مثال کے طور پر ایک شعر سُنیئے۔

بس تمہاری طرف سے جو کچھ ہو
میری سعی اور میری ہمت کیا

فوراً خیال "السعی منی واتمام من اللہ تعالیٰ" کی طرف جاتا ہے۔ لیکن الفاظ میں جو سیدھا پن ہے اور لب و لہجہ میں جو ملائمت اور گداز ہے وہ اس شعر کو عام اور ہمہ گیر بنائے ہوئے ہے ایک دائم الخمر اپنے بازاری محبوب سے بھی یہی کہہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ اتنا ہی خود فراموش ہو اور معیارِ عشق پر پورا اترتا ہو۔ اور آسیؔ کا معیارِ عشق کیا ہے؟ وہ بھی سُن لیجئے۔

عاشقی میں ہے محویت درکار
راحتِ وصل و رنجِ فرقت کیا

اسی غزل کا ایک اور شعر سننے سے تعلق رکھتا ہے:

نہ گرے اس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا مصیبت کیا

اگر یہ خیال کسی اور شاعر کو سوجھتا جو رعایتِ لفظی کو ضروری سمجھتا تو یہ شعر الفاظ کی بازی گری ہو کر رہ جاتا اور اس میں کوئی تاثیر نہ ہوتی لیکن جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہو گا آسیؔ کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ تمام آرائش اور تکلف کے باوجود اپنے کلام کو اس تاثیر سے بھر دیتے ہیں جو خلوص اور سادگی سے پیدا ہوتی ہے۔ تشبیہات و استعارات کی شاعری دنیا میں بہت کم تاثیر کی شاعری ہو سکی ہے مگر آسیؔ کے دل میں کیفیت پہلے ہوتی ہے اور تشبیہات و استعارات اور دوسرے مناسبات بعد کو سُوجھتے ہیں اسی لیے ان کے تشبیہات و استعارات بھی ان کے جذبات و تاثرات کے لازمی عناصر بن جاتے ہیں اور صورت و معنی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جو شعر ابھی سنایا گیا ہے اس پر غور کیجئے۔

ظاہر ہے کہ "گرنا" اور "افتاد" میں رعایت ملحوظ ہے۔ لیکن شاعر خود اس قدر متاثر ہے اور اس رعایت کی واقعیت کو اس شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے کہ آج ہر سننے والے کو اس کی واقعیت ایک نہایت عام بات معلوم ہو رہی ہے۔ لفظ اور معنی کو ایک کر دینا اس کو کہتے ہیں۔ "گرنے" کے لغوی معنی گرنے" کے استعاری معنی "نگاہ سے گرنے" کا محاورہ۔ "افتاد" اور "مصیبت" سب ایک ہی حالت کے مختلف نام ہیں:

اس غزل کے دو اشعار اور سُن لیجئے۔

جن میں چرچا نہ کچھ تمہارا ہو
ایسے احباب ایسی صحبت کیا

جاتے ہو جاؤ ہم بھی رخصت ہیں
ہجر میں زندگی کی مدت کیا

آسی کی ہر بات ہمارے دل میں تیر کی طرح اتر جاتی ہے اس لیے کہ وہ حال اور بیان حال میں کوئی فرق باقی نہیں رہنے دیتے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

جو رہی اور کوئی دم یہی حالت دل کی
آج ہے پہلوئے غم ناک سے رخصت دل کی

اگر کبھی بھی آپ کے دل کی یہ حالت رہ چکی ہے تو اب آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ اس حالت کو بیان کیسے کرتے ہیں۔ کسی قدیم مشرقی نقادِ سخن کا یہ خیال بہت صحیح ہے کہ اصلی شعر وہ ہے کہ ہر سُننے والا سمجھے کہ یہ تو میں بھی کہہ سکتا تھا لیکن جب کہنے بیٹھے تو معلوم ہو کہ واقعی اس کے لیے کس دل سوزی اور جگر خراشی کی ضرورت ہے۔ آسی کا یہ شعر ایسا ہی ہے۔ اس غزل کے تین شعر اور پیش کرنا چاہتا ہوں:

کوچۂ یار سے گھبرا کے نکلنا کیا تھا
دل کو شکوے ہیں مرے مجھ کو شکایت دل کی

اگر آپ کو زندگی میں کبھی بھی "کوچۂ یار" سے سابقہ رہا ہے اور اگر آپ کے اندر حمیتِ عشق کا کچھ بھی اثر باقی ہے تو آپ کے دل کو آپ سے اور آپ کو اپنے دل سے یہی شکایت ہو گی۔

اس شعر میں وحشتِ دل کا کیسا بے تکلف اور بے ریا نقشہ کھینچا ہے

گھر چھٹا شہر چھٹا کوچۂ دل دار چھٹا
کوہ و صحرا میں لیے پھرتی ہے وحشت دل کی

مقطع میں جس تسلیم و رضا کی ترغیب دی گئی ہے وہ منتہائے عشق ہے اور ہر عاشق کے مقدر کی چیز نہیں ہے:

راستہ چھوڑ دیا اس نے ادھر کا آسی
کیوں بنی رہ گذرِ یار میں تربت دل کی

آسی کے کلام کے مطالعہ کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ کامیاب ادب میں لفظ اور معنی کے درمیان کوئی دوئی نہیں رہتی۔ لفظ ہی معنی اور معنی ہی لفظ ہوتا ہے۔ شاعر کا کام نہ صرف یہ ہے کہ معنی کے لیے لفظ تلاش کرے بلکہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ لفظ کی معنوی کیفیت کو بڑھا دے۔ مسیح کا معجزہ کچھ اس سے زیادہ نہ تھا۔ الفاظ وہی تھے جو لغت میں صدیوں سے موجود تھے۔ صرف ان کی معنوی کیفیت اور معنوی شدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مُردوں میں بھی جان پڑ جاتی تھی۔ آسی نے اپنے بہترین اشعار میں یہی کیا ہے۔ وہ فرسودہ سے فرسودہ الفاظ کو ایسے وقت اور ایسی ترکیب کے ساتھ لاتے ہیں اور اس کے اندر ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ لفظ ہمارے لیے بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ اس وقت مجھے ان کی ایک رُباعی یاد آ رہی ہے۔

غنچے! تجھے میری دل فگاری کی قسم
شبنم! تجھے میری اشک باری کی قسم
کس گل کی نسیم صبح خوشبو لائی
بے تاب ہے دل جنابِ باری کی قسم

ذرا اس "جنابِ باری" پر غور کیجئے گا۔ کس قدر عام اور پرانی اصطلاح ہے لیکن آسی نے جیسا اس کو نئی معنوی کیفیت سے بھر دیا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں یہ قسم نہ کھائی گئی ہوتی تو نہ شاعر اس حالت کو پوری طرح بیان کر سکتا اور نہ ہم خاطر خواہ اس سے متاثر ہو پاتے۔ شاعر کی زبان قسم کی تہذیب و تحسین کرتی چلی گئی ہے یہاں تک کہ اس کی قسم اس کی حالت پر محیط ہو گئی ہے۔

چند خالص استعاری انداز کے اشعار سُنیے جن میں صرف استعارہ سے کیف و جذب پیدا کیا گیا ہے۔

ناتوانوں کے سہارے کو ہے یہ بھی کافی
دامنِ لطف غبارِ پسِ محمل دینا

کیا اس شعر نے "غبارِ پسِ محمل" کو ہمارے لیے ایک جاندار حقیقت نہیں بنا دیا ہے؟

یا یہ شعر۔

ذوق میں صورتِ موج آ کے فنا ہو جاؤں
کوئی بوسہ تو بھلا اے لبِ ساحل دینا

اگر استعارہ اس قدر کامل ہو اور اس میں ایسی لازمیت پائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں تاثیر نہ ہو۔ استعارہ اس وقت بے اثر ہوتا ہے جب کہ وہ ہمارے کسی خیال یا جذبہ پر حاوی نہ ہو سکے۔ آسیؔ کا ہر استعارہ اضطراری ہوتا ہے اور اس میں آورد کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ ان کے دیوان میں ایسے اشعار کی بھی کثرت ہے جو سیدھے سادے ہیں اور جن کی تاثیر کا راز ان کی سادگی اور معصومیت میں ہے مثلاً اسی غزل کے یہ دو شعر:

ہائے رے ہائے تری عقدہ کشائی کے مزے
تو ہی کھولے جسے وہ عقدۂ مشکل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

یا یہ غزل:

پسند آئے تو لے لو دل ہمارا
مگر پھر دل بھی کس قابل ہمارا

چھری بھی تیز ظالم نے نہ کر لی
بڑا بے رحم تھا قاتل ہمارا

نہیں ہوتا کہ بڑھ کر ہاتھ رکھ دیں
تڑپتا دیکھتے ہیں دل ہمارا

نہ آنا ہم تمہارا دیکھ لیں گے
جو نکلا جذبِ دل کامل ہمارا

لیکن اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے:

دلِ گردوں سے لے کرتا دلِ دوست
گیا نالہ کئی منزل ہمارا

ہم ان تمام منزلوں کو احاطہ کرنے سے قاصر ہیں جو ہمارے دل سے دلِ گردوں تک اور پھر دلِ گردوں سے دلِ دوست تک حائل ہیں اور جن کو ہمارا شاعر اس سہولت کے ساتھ بات کی بات میں طے کر گیا ہے۔ اس کے لیے جس کائناتی بصیرت COSMIC VISION اور جس مافوقی تخیل TRANSCENDENTAL IMAGINATION کی ضرورت ہے وہ ہر شخص کے نصیب کی چیز نہیں۔

آسیؔ کی شاعری اس بات کا پورا پتہ دیتی ہے کہ وہ صاحبِ کیف و حال تھے اور یہ کیف و

حال صوفیانہ سے کہیں زیادہ عاشقانہ تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آسی کے تجربہ میں کیف وحال کی یہ تقسیم تھی ہی نہیں۔ ان کا ہر شعر ایک وجد ہوتا ہے اور اس مقام کی خبر دیتا ہے جہاں خارجی اور داخلی میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں گرد و پیش کی ہر حالت ایک کیف باطن ہو جاتی ہے جہاں محبت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور "نظر و ناظر و منظور" سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ آسی چونکہ زندگی اور محبت کے تمام درمیانی اور ادنیٰ مراحل و منازل طے کر کے اس منزل پر پہنچے ہیں اور جن جن صعوبتوں اور مشقتوں سے ان کو دوچار ہونا پڑا ہے ان کو بھولے نہیں ہیں بلکہ ان کی ماہیت اور اہمیت کے اب بھی قائل ہیں اس لیے جب وہ کوئی بات کہتے ہیں تو اس میں ان مرحلوں اور صعوبتوں کی بھی پوری جھلک ہوتی ہے لیکن وہ بات ہوتی ہے ان کی اپنی منزل سے۔ اسی لیے ان کی شاعری ہمارے اندر کسی قسم کی دوری یا اجنبیت کا احساس پیدا کئے بغیر ہم کو غیر شعوری طور پر رفعت و تمکین کے احساس سے معمور کرتی رہتی ہے۔

آسی کے کلام سے ہمارے اندر کبھی افسردگی یا بے دلی نہیں پیدا ہوتی جیسا کہ بعض دوسرے متغزلین کے مطالعہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا سوز و گداز ہمارے دل میں ایک نئی تاب پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی دردمندی میں نشاط کا ایک پہلو ہوتا ہے جو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ محبت کے غم کو زندگی کی اپج بنا دیتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام میں وہ اثر ہے جو میر کی خاص شان ہے۔ ایک غزل کے کچھ اشعار سنیے۔

اسی کے جلوے تھے لیکن وصالِ یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا

خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا

غلط ہے حکمِ جہنم کسے ہوا ہوگا
کہ مجھ سے بڑھ کے تو کوئی گناہ گار نہ تھا

وفورِ بے خودیٔ بزمِ مے نہ پوچھو رات
کوئی بجز نگہِ یار ہوشیار نہ تھا

لحد کو کھول کے دیکھو تو اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مستعار نہ تھا

تو محوِ گلبن و گلزار ہو گیا آسی
تری نظر میں جمالِ خیالِ یار نہ تھا

آج تک میری نظر سے غالبؔ کے علاوہ اُردو میں کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا ہے جس کی ایک ایک غزل میں اتنے اشعار قابلِ انتخاب نکل آتے ہوں اور اگر آپ لوگ انصاف کریں تو میرے اس انتخاب کو جوشِ عقیدت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے شعر میں وصل کا جو بلند اور ناقابلِ حصول تصور پیش کیا گیا ہے اور جس طرح یہ ذہن نشین کیا گیا ہے کہ تڑپتے رہنا عاشق کا فطری منصب ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ دوسرے شعر میں ذوات واعیان اور مظاہر و حوادث میں جو ازلی تعلق ہے اس کو جس حسنِ اسلوب کے ساتھ واضح کیا گیا ہے وہ نہایت دل پذیر ہے۔ تیسرے شعر میں جس اعتماد اور جس اطمینان کے ساتھ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کیا گیا ہے وہ ان کمزوریوں اور خامیوں کو سراسر توانائی اور پختگی بنائے ہوئے ہے اس کے بعد کے دو شعر ایسا تیر کی طرح دل میں بیٹھ جاتے ہیں کہ شاید ہی کوئی نقادِ سخن ان کو انتخاب سے خارج کرنا گوارا کرے۔ مقطع میں استغراق کی جو نئی تخئیل ہے اور جس حسن کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ شاعر "جمالِ یار" کے خیال میں نہیں بلکہ "خیالِ یار" کے جمال میں محو ہو جانے کی تحریک کر رہا ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے اور دوسرے مظاہر میں بہل جاتے ہیں ان کو موردِ طعن سمجھتا ہے۔

اگر محض فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بھی آسیؔ کو ایک قادر الکلام شاعر ماننا پڑتا ہے۔ اسلوب اور زبان میں بھی ان کا ایک مرتبہ ہے۔ اگر وہ اثر و تاثیر میں متقدمین سے آنکھیں ملا سکتے ہیں تو زبان اور رعایات و تکلفات میں متاخرین سے بھی جو بھر کم نہیں ہیں اور پھر اس امتزاج کو انہوں نے کس قدر حسین اور دل فریب بنا دیا ہے۔ اب آخر میں ان کی غزلوں سے ہر قسم کے اشعار منتخب کر کے سُناتا ہوں تا کہ آسیؔ کے متعلق جتنی باتیں کی گئی ہیں ان کی خاطر خواہ تشریح و تائید ہو سکے۔

وفا دشمن ہو تم یا ہو جفا دوست
بہر صورت مجھے رہنا رضا دوست

کوئی دشمن ہو یا آسیؔ مرا دوست
میں سب کا دوست کیا دشمن ہو کیا دوست

ترقی اور تنزل کی نہ پوچھو
میں دشمن ہو گیا دشمن ہوا دوست

مجھے نیرنگِ دل نے مار ڈالا
یہ دشمن کا ہے دشمن دوست کا دوست

فریبِ عالمِ صورت سے بچنا
نہیں کوئی کسی کا جز خدا دوست

فقیروں کا بنا لو بھیس آسیؔ
وہ شاہنشاہِ خوباں ہے گدا دوست

عشق میں کہتے ہیں کامل آسیؔ دل گیر تھا
آہ جس کی بے اثر تھی نالہ بے تاثیر تھا
حالتِ دل خاک میں کہتا کہ تا ہنگامِ مرگ
آپ کا شکر جفا یا شکوۂ تقدیر تھا
عشق نے فرہاد کے پردے میں پایا انتقام
ایک مدت سے ہمارا خون دامن گیر تھا
وہ مصور تھا کوئی یا آپ کا حسن و شباب
جس نے صورت دیکھ لی اک پیکرِ تصویر تھا

نقشِ دو جہاں گردشِ پیمانۂ دل تھا
کُن روزِ ازل نعرۂ مستانۂ دل تھا
خوشبو وہی رنگت وہی مستی بھی اسی کی
کعبہ میں بھی دورِ مئے میخانۂ دل تھا
ذوقِ غم و اندوہِ محبت کے میں صدقے
جو داغ دیا تم نے وہ جانانۂ دل تھا

آئینہ آپ کے نزدیک جو نامحرم ہے
آپ نے خاک نہ جانا کہ مجھے کیا غم ہے
عشق کہتا ہے دو عالم سے جدا ہو جانا
حسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے
میرے دشمن کو نہ مجھ پر کبھی قابو دینا
تم نے منہ پھیر لیا آہ یہی کیا کم ہے

ایک عالم کے طلسمات میں جی چھوٹ گیا
ہر ادا ہے نگہِ ناز نیا عالم ہے

قطرہ میں کچھ نہیں پانی کے سوا کیا کہیے
بات کہنے کی نہیں ہے بخدا کیا کہیے

لالہ و گل میں اُسی رشکِ چمن کی ہے بہار
باغ میں کون ہے اے بادِ صبا کیا کہیے

ایک ہستی کے سوا ہم نے نہ جانا کچھ بھی
اے نیگرین اب اور اس کے سوا کیا کہیے

بہر صورت طلب لازم ہے آبِ زندگانی کی
اگر پایا خضر تم ہو نہ پایا تو سکندر ہو

کوئی تو پی کے نکلے گا اڑے گی کچھ تو بُو منہ سے
درِ پیرِ مغاں پر مے پرستو چل کے بستر ہو

کسی کے در پہ آسی رات رو رو کر یہ کہتا تھا
کہ آخر میں تمہارا بندہ ہوں تم بندہ پرور ہو

ایک جلوے کی ہوس وہ دمِ رحلت بھی نہیں
کچھ محبت نہیں ظالم تو مروّت بھی نہیں

جو دیا تو نے تری راہ میں سب کھو بیٹھے
ہاں اگر شکر نہیں ہے تو شکایت بھی نہیں

ٹکڑے ہو کر جو ملی کوہکن و مجنوں کو
کہیں وہ میری ہی پھوٹی ہوئی تقدیر نہ ہو

وہ بھی کچھ عشق ہے جو درد کی لذت نہ چکھے
وہ بھی نالہ ہے جو حسرت کشِ تاثیر نہ ہو

جس کو دیکھا اُسے چھاتی سے لگائے دیکھا
دل جسے کہتی ہے خلقت تری تصویر نہ ہو

حاصلِ صحبتِ غم ناک بجز غم کیا ہے
دل مرا لیتے ہو ڈرتا ہوں کہ دل گیر نہ ہو
صاف دیکھا ہے کہ غنچوں نے لہو تھوکا ہے
موسمِ گل میں الٰہی کوئی دل گیر نہ ہو

سوئے دشت ایک قدم ایک ترے گھر کی طرف
سر میں سودا ہے تو ملنے کی تمنا دل میں
داغوں میں روشنیٔ شمعِ سرِ طور ہے آج
کون ہے اے شبِ غم انجمن آرا دل میں

کس دشت میں عشق نے تھکایا
ہر ریگِ رواں ہے کارواں سوز
اس خلوتِ راز کے طلسمات
جو راز کھلا وہ راز داں سوز

یہ دونوں ایک ہی ترکش کے ہیں تیر
محبت اور مرگِ ناگہانی
علم کر خلد میں بھی خنجرِ ناز
تصدق ہے حیاتِ جاودانی

جو یہ کد ہے کوئی بلبل کی صورت نعرہ زن کیوں ہو
کوئی گل فام کیوں ہو گل بدن گل پیرہن کیوں ہو
تمہیں سچ سچ بتا دو کون تھا شیریں کی صورت میں
کہ مشتِ خاک کی حسرت میں کوئی کوہکن کیوں ہو

اس کا بھی تو اب پتہ نہیں ہے
لائے تھے یہاں دلِ حزیں ہم

کون اس گھاٹ سے اُترا کہ جنابِ آسیؔ
بوسہ لینے کو بڑھے ہیں لبِ ساحل کی طرف

دل جس سے مل گیا وہی نکلا بجائے دل
یا یوں کہو کہ کچھ بھی نہیں ہے سوائے دل

جنبش بھی کبھی اپنے ارادہ سے نہ کر
چلتے ہیں تو چلّاتی ہے زنجیر ہماری

رات ہے رات تو بس مردِ خوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی یا ذوقِ مناجات کی رات

کمی نہ جوششِ جنوں میں نہ پاؤں میں طاقت
کوئی نہیں جو اُٹھا لائے گھر میں صحرا کو

نہ مرض کچھ ہے نہ آسیب نہ سایا ہم کو
اک پری زاد نے دیوانہ بنایا ہم کو

آج وہ ہیں مجمعِ احباب ہے
ایک مہجور آسیؔ بے تاب ہے

اور کیا چاہتی ہے آرزوئے دل ان سے
کچھ نہیں حُسن کی سرکار میں حسرت کے سوا

یہ ہے آسیؔ کے کلام سے انتخاب۔ میں نے اوّل اوّل دو سو سے زائد اشعار کا انتخاب کیا تھا لیکن پھر بیشتر ایسے اشعار کو نکال کر انتخاب کو مختصر کر دیا جو کافی مشہور و معروف ہیں۔ کہا جاسکتا ہے

کہ یہی غزل گوئی آسیؔ کا حاصل عمر ہے اس لیے کہ اردو شاعری میں جو چیز ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گی وہ ان کی غزل ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے نمایاں شان ان کی غزلیت ہے جو ان کی رباعیوں میں بھی موجود ہے۔ رباعی کی صنف میں بھی آسیؔ کا ایک مرتبہ ہے۔ دو رباعیاں سُنا چکا ہوں چند اور سُنیئے:

یا مجھ کو ترا حُسن نہ بھایا ہوتا
یا ہر رگ وپے میں تو سمایا ہوتا
یا دل ہی میں جلوہ گر اگر ہونا تھا
ہر جزوِ بدن کو دل بنایا ہوتا

کب تک کوئی اپنے دل کے غم کو روئے
کب تک کوئی یار کے ستم کو روئے
ہر دم یہ رُلا رہی ہے الفت جس کی
اللہ کرے کہ اب وہ ہم کو روئے

جن سے رہ و رسم کی وہ رہزن نکلے
بھولا جنھیں سمجھے تھے وہ پُرفن نکلے
جان اپنی جن احباب کو ہم سمجھے آہ
وہ دل کی طرح ہمارے دشمن نکلے

جس کی طبیعت میں یہ گداز اور جس کی زبان میں یہ نرمی ہو وہ کسی اور صنفِ سخن کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ شاید عشقیہ مثنوی میں بھی آسیؔ کامیاب رہتے لیکن جس جذب وحال کے عالم میں وہ رہا کرتے تھے وہ مسلسل گوئی کے منافی تھا اسی لیے انھوں نے غزل رباعی کے سوا کسی اور صنف کی طرف توجہ نہیں کی۔ دو قصیدے لکھے ہیں جن میں ایک تو نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کی شان میں ہے اور مکمل ہے۔ دوسرا میر محبوب علی خاں نظام دکن کی مدح میں ہے اور ناتمام ہے۔ ان قصیدوں میں فن کے اعتبار سے کوئی بات قابلِ لحاظ نہیں ہے۔ البتہ تشبیب دونوں قصیدوں کی خوب ہیں اور خالص غزل کا حکم رکھتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہاں ترا کوئی بحرِ وجود میں ثانی
حبابِ دیدۂ اہلِ نظر میں ہے پانی

ہے بہار لبِ گل سے "میں بہار" تو کیا
یہ شورِ کشتنِ منصور وائے نادانی
اگر یہ میں ہوں تو کیا تیری ذات ہے محدود
اگر یہ تو ہے تو پھر کیا وجودِ امکانی

دوسرا قصیدہ :

کسی کو دیکھ کے لغزش جو پاؤں میں آئی
شراب پی کہ وہ آنکھیں نہ ہوں کہیں بدنام
بس اتنے پر کہ لبِ لعلِ یار چوم لیا
میرے فرشتے نے لکھا ہے مجھ کو مے آشام
کوئی کہے مجھے دیوانہ کوئی سودائی
تمہارے عشق نے کیا کیا کیا مجھے بدنام
کسی طرح کسی قالب میں انقلاب تو ہو
خدا کرے کہ جدائی ہو داخلِ ایام

آپ لوگوں کو شاید یہ شکایت ہو کہ میں نے خواہ مخواہ اتنا لمبا انتخاب پیش کر کے بات کو ضرورت سے زیادہ طول دے دیا جو محض میرے جذبۂ عقیدت اور بڑھے ہوئے حسنِ ظن کی دلیل ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تنقید بھی ادب ہی کی ایک صنف ہے اور لکھنے والے کے ذاتی ذوق اور اس کے اپنے جذبات سے کبھی الگ نہیں کی جا سکتی لیکن یقین مانیے میرا اصل مقصد یہ تھا کہ خود آپ کو بھی فیصلہ کرنے میں سہولت ہو اور آپ خود تسلیم کر لیں کہ جس شاعر کا دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہو اس کی شاعری کو اردو شاعری کی تاریخ میں داخل نہ کرنا یا تو تصوف کا ایک غلط زعم اور بے جا رتبہ شناسی ہے یا پھر محض بدذوقی اور بے بصری۔ اب آخر میں چند اور اشعار سُنا کر اپنے مقالہ کو ختم کرتا ہوں اور آپ لوگوں سے رخصت چاہتا ہوں :

اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو
چشمِ بیمار کے بیمار ہیں بیمار ہنوز
کیا خراباتیوں کو حضرت آسی نہ ملے
کہ سلامت ہے وہی جبّہ و دستار ہنوز

انہیں کانوں سے انا الحق کے سنتے ہیں نعرے
آدمی عشق میں کیسا جانیے کیا ہوتا ہے

ملنے کی یہی راہ نہ ملنے کی یہی راہ
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہ گزر ہے

اب کہیں آسیؔ نالاں ہے نہ قیس و فرہاد
کیا ہوئے کنگرۂ عرش ہلانے والے

بک گئے روزِ ازل پیرِ خرابات کے ہاتھ
ہم ہوئے تم ہوئے یا آسیؔ مے خوار ہوا

مجنوں گورکھپوری
(نکاتِ مجنوں)

افسوس کہ اس کتاب کے چھپنے سے پہلے ہی ۴ر جون ۱۹۸۸ء کو کراچی میں مجنوں صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اقتباسات

"حضرت آسی کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مذاقِ سلیم کسی غزل میں تلاش کرتا ہے۔ اندازِ بیان کی متانت و پختگی، مضامین کا عُلو، خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی و لطافت اُن کے کلام کے مخصوص عناصر ہیں اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو اُن کے کلام کو نیرنگی و اعتبار کے بلند درجہ پر پہونچا دیتی ہیں۔ ایک خاص خوبی حضرت آسی کے کلام کی یہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں بھرتی کے شعر بالکل نہیں ہوتے اور سُوقیت و عامیانہ مذاق سے کلام پاک ہے۔ نیز جرأت و داغ کی طرح ہوس ناکی، سفاہت بھی اُن کے یہاں پائی نہیں جاتی۔ آسی ایک صاحبِ حال، صاحبِ دل، صاحبِ نسبت بزرگ تھے اس لیے فطرتاً اُن کا کلام تصوّف کی چاشنی سے معمور ہے۔ وہ کبھی تو ایسے اشاراتِ صوفیانہ کر جاتے ہیں جس سے کلام کی رنگینی و رعنائی حد درجہ دل پذیری کی شان اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کسی خاص مسئلہ تصوف پر شاعرانہ رنگ میں روشنی ڈال جاتے ہیں۔ اور کبھی مجاز کے پردہ میں رموزِ حقائق کی طلسم کشائی کر جاتے ہیں۔ چونکہ تصوف میں بھی حضرت آسی کا مذاق وحدت الوجود کا ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر وہ مختلف والہانہ اور مستانہ انداز سے اپنے وارداتِ قلب کو قالبِ شعر میں ڈھال کر پیش کر جاتے ہیں جن کو سُنتے ہی سامع پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مذاقِ سلیم پہروں سر دُھنتا ہے۔"

عارف ہسوی (مرحوم)

(نقل از "سمات الاخیار" مطبوعہ جونپور، یو پی، ۱۳۴۴ھ)

۲

" آسی غازی پوری کے کلام کے بھی ہم دونوں عاشق تھے جسے لذّت لے لے کر ایک دوسرے کو سُناتے تھے اور جس پر دونوں مل کر تبصرے کیا کرتے تھے۔ کئی برس بعد ایسا ہوا کہ میں کان پور سناتن دھرم کالج میں پروفیسر ہو گیا اور مجنوں جو اب بی اے پاس کر چکے تھے گورکھ پور ہی میں تھے۔ ہم دونوں کے شعور اور وجدان کے باہمی ربط کا یہ کرشمہ تھا کہ بغیر ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے ہم دونوں نے پچاسں رباعیاں کہہ ڈالیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھا کہ آسی کی رباعیوں

سے متاثر ہو کر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں۔ ہم دونوں اب تک اس حسنِ اتفاق پر حیرت کرتے ہیں"۔

فراق گورکھپوری

(مضمون "مجنوں گورکھپوری" نقوش لاہور شخصیات نمبر صـ۲۹۶
جنوری ۱۹۵۵ء

۳

"ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر سید محمود مرحوم سابق وزیر خارجہ حکومتِ ہند) کو جونپور کی خانقاہ رشیدیہ سے بھی بڑا گہرا روحانی تعلق تھا، یہ تو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ اس سلسلہ میں بیعت بھی تھے لیکن ان کو اسی سلسلہ کے مشہور شیخ مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری سے ایسی عقیدت و وابستگی تھی کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اپنی نوجوانی میں ان سے بیعت ہو گئے تھے، اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ ان کا کلام بڑے شغف اور جوش عقیدت کے ساتھ پڑھتے تھے اور اکثر ان کا تذکرہ فرماتے تھے"۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

('پرانے چراغ' کراچی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۷۵ء صـ۳۸۴
بابت ڈاکٹر سید محمود مرحوم)

۴

"اس سفر (بسلسلۂ مقدمۂ کراچی) میں رات کے طول طویل گھنٹے درود و سلام کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیئے اور آسی غازی پوری کا یہ شعر سارے سفر میں برابر وردِ زبان رہا ؎

وہاں پہونچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد"

مولانا محمد علی جوہر

(قومی ڈائجسٹ' لاہور' اپریل ۱۹۸۸ء ، صـ۱۶۱)

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ؕ

شعر گوئی نہ سمجھنا کہ مرا کام ہے یہ ؞ قالبِ شعر میں آسی فقط الہام ہے یہ

سخن کی جان، الہامی کلام، بیانِ تلمیذ رحمٰن محبوب یزدان قطب العارفین غوث العالمین حضرتِ شیخ محمد عبد العلیم آسی رشیدی رضی اللہ عنہ وعنا بہ

دیوانِ آسی

المعروف بہ

عینُ المعارف

جس کو ناہج مناہج طریقت جناب سید شاہ شاہد علی صاحب رشیدی سجّادہ نشین حضرت مصنف نے تالیف کیا

معذرت

میں نے پیرو مرشد بحرالاسرار قاسم الانوار قطبُ العُرفاء والعشاق حضرت شاہ محمد عبدالعلیم صاحب آسی قدس سرہٗ کے حالات تفصیل کے ساتھ وقتاً فوقتاً جو یاد آتے جاتے تھے لکھ رکھے تھے اور اُن کی تین نقلیں بھی کر کے رکھ دی تھیں۔ نیت یہ تھی کہ جب **عینُ المعارف** دوبارہ شائع ہوگا تو اُس میں یہ حالات شامل کردیئے جائیں گے۔ مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ جب **عینُ المعارف** چھپنے لگا اور مطبع سے حضرت قدس سرہٗ کے حالات کی مانگ آئی تو میں نے جس بکس میں محفوظ رکھا اُس میں تینوں نقلوں کا پتہ نہیں ملا۔ معلوم نہیں کیوں کر ضائع ہوگئیں، اب تک اُن کی تلاش جاری ہے۔ مجبوراً اِس عُجلت میں جتنے حالات یاد آسکے حوالۂ قلم کرتا ہوں اور ناظرین سے خطا پوشی کا خواستگار ہوں۔

یہ حالات زیادہ تر میں نے حضرت قدس سرہٗ کی زبان سے سُنے تھے اور کچھ **سماط الاخیار**[1] سے بھی اخذ کئے گئے ہیں۔

نثر کے میدان میں یہ میری پہلی گام زنی ہے اس لیے عبارت میں جو خامیاں ہوں اُن کو ناظرینِ کرام عفو سے کام لیں۔

شاہد علی علیمی رشیدی غفرلہٗ

---

[1] سماط الاخیار

مختصر حالات

تاریخ ولادت و وفات

۱۹ ر شعبان المعظم ۱۲۵۰ھ، تاریخی نام ظہور الحق، تاریخ وفات ۲ ر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ مطابق ۲ ر فروری ۱۹۱۷ء، نام محمد عبد العلیم صاحب المتخلص بہ آسیؔ۔ آپ کے والد ماجد قطب العارفین حضرت شیخ قنبر حسین قدس سرہٗ نسباً سلسلۂ جدی سے انصاری تھے۔ جدِّ مادری آپ کے اجداد کے بندگی شیخ مبارک قدس سرہٗ تھے جو حضرت مولانا مظفر بلخی کی اولاد میں تھے اور عدن سے سکندرپور تشریف لائے تھے جن کا مزارِ مبارک سکندرپور میں حضرت پیر و مرشد کے مکان سے قریب زیارت گاہ خلائق ہے۔

آپ کی والدہ ماجدہ قاضی پورہ ضلع آرہ کی تھیں جو حضرت مفتی احسان علی صاحب قدس سرہٗ کی پوتی تھیں۔ حضرت مفتی احسان علی صاحب قدس سرہٗ حضرت شاہ غلام حیدر صاحب بلیاوی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں تھے۔ بارہ برس کی عمر سے تا وفات مفتی صاحب قدس سرہٗ کی نمازِ تہجد کبھی قضا نہیں ہوئی تھی۔ مفتی صاحب کی اہلیہ صاحبہ کو حضرت خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کی حضوری اس طرح حاصل رہتی تھی کہ ادنیٰ ادنیٰ سی بات میں بغیر خاتونِ جنت سے دریافت کئے ہوئے کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ کسی نے کوئی بات پوچھی، آپ نے فرمایا کہ حضرت بی بی سے دریافت کر لوں تو جواب دوں۔ آنکھیں بند کرتیں اور فوراً پوچھ کے جواب دے دیتیں۔

حضرت کی والدہ ماجدہ کا انتقال حضرت کی صغر سنی میں ہو گیا تھا۔ نانی صاحبہ نے پرورش کی۔ والد ماجد کی بیعت اور حضرت کے پیر و مرشد قطب الہند ابوالخیر حضرت شاہ غلام معین الدین قدس سرہٗ کی بیعت قطب العالمین قیام الحق محی الدین حضرت شاہ امیر الدین حیدری رشیدی قدس سرہٗ کے دستِ مبارک پر ایک ساتھ ہوئی تھی اور تعلیم ظاہری و باطنی بھی ساتھ ساتھ ہوئی خلافت بھی دونوں بزرگوں کو ایک ساتھ عطا ہوئی۔ حضرت فرماتے تھے کہ میرے پیر و مرشد اور والد ماجد کے مراتب میں صرف اس قدر فرق تھا کہ والد ماجد سے ایک راز وقتِ وصال فاش ہوا اور پیر و مرشد وقتِ وصال بھی ضبط کر لے گئے۔ واقعہ یہ تھا کہ شب عاشورۂ محرم میں جب آپ کی حالت ردّی ہوئی اور اعزا پریشان تھے آپ نے فرمایا کہ میری حالت کی وجہ سے تم لوگ

رسمِ تعزیہ داری میں کوئی تاخیر نہ کرو اور جس طرح تمام رسومات ادا ہوتی تھیں ادا کرو اور مجھ کو چھوڑ کے جاؤ۔ شب کے اخیر حصّہ میں جب وقتِ وصال قریب آیا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت سیّد الکونین علیہ السلام مع کُل صحابہ اور سید الشہدأ اور جملہ پیرانِ کرام کے مجھ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ اب میں ان لوگوں کے ساتھ جاتا ہوں۔ سب سے رخصت ہوئے، کلمہ طیبہ پڑھا اور روح پرواز کر گئی۔ چہرۂ مبارک کے سامنے دیوار پر سفید دائرہ روشنی کا اندھیری رات میں اس طرح سے نمودار تھا کہ جیسے آفتاب کا عکس پڑتا ہو۔ جب صبح ہوئی اور روشنی بڑھتی گئی تو وہ عکس مٹتا گیا۔

حضرت کی شادی غازی پور محلہ نور الدین پورہ میں منشی راحت علی صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ منشی راحت علی صاحب امامیہ مذہب کے تھے، اُن کی صاحبزادی بھی امامیہ مذہب کی تھیں۔ حضرت نے کبھی اپنی اہلیہ سے تبدیلِ مذہب کا ذکر نہ کیا، مگر انہوں نے خود ہی کچھ دنوں کے بعد حضرت کا مذہب اختیار کرنے کی درخواست کی۔ منشی راحت علی صاحب نے اپنی وفات کے قریب شاہ محمد معصوم صاحب کو جو شاہ مراد عالم صاحب گورکھپوری کے اکمل خلیفہ تھے آپ کا سلسلۂ بیعت حضرت شاہ سلیمان صاحب طوسوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا تھا اپنے پاس بلایا اور کہا کہ آپ درویش ہیں اور مجھ کو آپ سے عقیدت ہے، آپ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ آپ یہ فرمائیے کہ آپ کا مذہب حق پر ہے یا میرا۔ شاہ محمد معصوم صاحب نے فرمایا کہ ہمارا مذہب حق ہے۔ منشی راحت علی صاحب نے حضرت شاہ محمد معصوم صاحب سے اور حضرت صاحب قدس سرہٗ سے فرمایا کہ آپ لوگ گواہ رہیئے میں آپ کا مذہب اختیار کرتا ہوں۔ اس کے بعد وفات پائی۔

حضرت صاحب کی اولادیں بہت تھیں مگر سنِ بلوغ کو بڑی صاحبزادی پہنچیں جن کا اسمِ مبارک جنّت بی بی تھا۔ اُن کی شادی غازی پور کے محلہ شجاول پور میں مولوی عبدالرشید صاحب سے ہوئی تھی مگر افسوس کہ عین شباب میں چھ سال کی ایک لڑکی چھوڑ کر دارالبقا کی راہ لی۔ صاحبزادی صاحبہ کا نام عزّت بی بی ہے۔

عزّت بی بی کی شادی حضرت نے اپنے ماموں زاد بھائی جناب مفتی وحید صاحب قدس سرہٗ ساکن قاضی پورہ ضلع آرہ کے صاحبزادہ مولوی غلام قادر مرحوم سے کی تھی۔ تاریخ عقد ۱۱ ذی القعدہ ۱۳۲۳ھ تھی۔ خدا کی مشیّت کہ شادی کے چند ہی دنوں بعد مولوی غلام قادر مرحوم کا انتقال ۲۳ محرم ۱۳۲۴ھ کو بھن برہ شریف کے آستانہ پر بعارضۂ طاعون ہو گیا۔ حضرت بھی اسی آستانہ پر تشریف فرما تھے، جوں ہی خبر ملی کہ روح پرواز کر گئی فوراً نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، فرمایا

کہ اللہ! تیرا شکر ہے یا اللہ تیرا شکر ہے اور نماز کی نیت باندھ لی۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ آج مجھ کو میرے پیر نے اپنا سا[1] بنا لیا۔ مولوی غلام قادر مرحوم کی بیعت ہنوز ہونے نہ پائی تھی مگر اُن کی تعلیم وتلقین حضرت سے ہوتی تھی۔ حضرت اُن کے بارے میں فرماتے تھے کہ جو ترقی باطنی دوسروں کو برسوں میں ہوتی ہے اُن کو ایک دن میں ہوتی تھی۔ حضرت اپنی والدہ ماجدہ سے اکیلے تھے۔ البتہ دو بھائی اور ایک بہن سوتیلی تھیں جن کا نام عبدالاحد اور عبدالواحد صاحب تھا۔ مولوی عبدالاحد مرحوم کے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام عبدالصمد تھا۔ مولوی عبدالصمد صاحب حاذق طبیب اور بہت ہی بے نفس آدمی تھے اُن کے دو صاحبزادے ہیں مولوی محمود اور مولوی حامد۔

مولوی عبدالاحد مرحوم جب بعارضۂ موت مبتلا ہوئے تو اخیر میں اُن پر کئی روز تک نزع کی کیفیت طاری رہی مگر کلمہ طیبہ منہ سے نہیں نکلتا تھا۔ حضرت فرماتے تھے کہ میں سرہانے بیٹھ کر سورۂ یٰسین پڑھ رہا تھا اُن کے منہ سے کلمۂ طیبہ جاری نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ سورۂ یٰسین پڑھتے پڑھتے غنودگی طاری ہوئی اور اپنے پیرومرشد حضرت شاہ غلام معین الدین صاحب قدس سرہٗ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں، "حلیم[2]! تم کیوں پریشان ہو وہ مرید میرا ہے کہ تمہارا؟" اس کے بعد آنکھ کھل گئی اور مولوی عبدالاحد صاحب کو کھانسی بڑے زور کی آئی اور ایک بلغم کا بہت بڑا ٹکڑا خارج ہوا جس سے اُن کی تکلیف بالکل رفع ہوگئی اور کلمہ منہ سے جاری ہوا۔ تین روز حیات رہے اور سوائے کلمۂ طیبہ کے کوئی لفظ منہ سے نہیں نکلا۔

حضرت کے تین چچا تھے جن کا نام قلندر حسین، قنبر حسین، الطاف حسین تھا، ایک کے صاحبزادگان مولوی ولی الحسنین، مولوی وصی الحسنین، محمد خلیل احمد، محمد وحید، محمد اسعد، محمد سلیم، محمد عبدالقدوس، وکیل احمد مرحومین تھے۔ مولوی ولی الحسنین کے صاحبزادے مولوی محمد احمد صاحب اور مولوی وصی الحسنین کے صاحبزادے مولوی نورالعینین صاحب مرحوم اور مولوی عبدالقدوس کے ایک صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادے کا نام مولوی عبدالسلام مرحوم تھا۔ ایک صاحبزادی سلیم پور منجھولی ضلع گورکھپور میں قاضی عبدالرب صاحب سے بیاہی تھیں۔

دوسرے چچا کے دو صاحبزادے تھے، مولوی عبدالعزیز اور مولوی محمد ظہور مرحومین۔ مولوی عبدالعزیز صاحب کے ایک صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ صاحبزادے کا نام مولوی عبدالحمید مرحوم تھا۔ صاحبزادی حکیم مولوی عبدالصمد صاحب سے بیاہی تھیں۔ محمد ظہور صاحب کے

---

[1] یعنی حضرت بھی اولاد ظاہری سے مستغنی تھے۔ [2] حضرت کے پیرومرشد حلیم کے نام سے پُکارتے تھے۔

ایک صاحبزادے ہیں جن کا نام مُلّا نظام الدین صاحب ہے۔ حضرت کے چچا زاد بھائیوں میں املاک خاندانی تقسیم ہو چکی تھیں مگر مولوی محمد ظہور اور مولوی عبدالعزیز مرحومین حضرت کے شریک رہے حضرت کی نواسی عزت بی بی صاحبہ جو بہنی صاحبہ کے نام سے مشہور ہیں بفضلِ حی اور قائم ہیں اور حضرت کے آستانۂ پاک اور زائرین کی باوجود توکّل کے حتی الامکان خدمت اور خاطر مدارات میں ذرّہ برابر کمی نہیں کرتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ اُن کی ذات بابرکات کو تادیر قائم رکھے اور آفاتِ ارضی وسماوی سے محفوظ رکھے' آمین۔

ہم لوگوں کے حضرت پیرو مرشد کی یہی ایک نشانی ہیں۔ حضرت کی ایک صاحبزادی جنہوں نے بلوغ کے قریب وصال فرمایا تھا اُن کے بارے میں حضرت فرماتے تھے کہ بچپن سے لے کر وفات تک کبھی کھیل میں بھی جھوٹ نہیں بولی تھیں۔

حضرت کی تعلیم

ابتدائی کتابیں تو حضرت نے دوسروں کو پڑھتے ہوئے سُن کر یاد کرلی تھیں سترہ' اٹھارہ برس کی عمر سے پچاس برس کی عمر تک آپ اپنے پیرومرشد کے ہمراہ رہے۔ درسیات فرنگی محل کے مشہور علامہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب قدّس سرّہٗ سے پڑھی تھیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ میں نے کوئی کتاب نصف صفحہ اور ایک صفحہ سے زیادہ اُستاد سے نہیں پڑھی' نصف سطر یا ایک سطر کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے اس میں رات کی رات گزر جاتی تھی۔ ایک بار محلہ میں کسی حلوائی کی دوکان پر مطالعہ کے لیے کتاب لے کر بیٹھ گئے۔ اُس سڑک سے ایک دھوم دھام کی برات گزر گئی اور خبر نہ ہوئی۔ فجر کی اذان پر چونکے کہ صبح ہوگئی۔ نصف سطر اور ایک سطر کے سبق میں چھ سات گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ اُستاد شاگرد دونوں پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ نصف صفحہ ایک صفحہ کے بعد مولوی عبدالحلیم صاحب قدّس سرّہٗ کتاب بند کرا دیتے اور فرماتے کہ اب کتاب ختم ہوگئی دوسروں کو پڑھاؤ مگر حضرت خود کتاب کا مطالعہ کرکے ختم کرلیتے۔

مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری بھی جو حضرت کے چچا زاد بھائی تھے اور حیدرآباد دکن میں جج تھے مولوی عبدالحلیم صاحب سے پڑھتے تھے۔ وہ جب کوئی اعتراض کیا کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب غور و فکر کے بعد اُس کا شافی جواب دے دیتے تھے۔ مگر حضرت جب ڈوب کر کوئی اعتراض کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب دو دو ہفتہ غور و فکر کے بعد کوئی کمزور سا جواب دیتے تو حضرت فرماتے کہ "حضرت آپ اُستاد ہیں کہئے مان لوں مگر میرے اعتراض کا جواب نہیں ہوا"۔ مولوی عبدالحلیم صاحب فرماتے کہ "کہتے تو صحیح ہو جواب تو نہیں ہوا' اب تم خود اپنے اعتراض کا جواب دو"۔ اس کے بعد حضرت خود اپنے اعتراض کا جواب دیتے تو مولوی عبدالحلیم صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

حضرت فرماتے تھے کہ جب میں شرح سُلّم پڑھتا تھا تو مطالعہ میں مُلّا بحرالعلوم کا حاشیہ نہیں دیکھتا تھا۔ مطالعہ کے بعد جب حاشیہ دیکھتا تو اکثر یہی ہوتا تھا کہ مُلّا بحرالعلوم سے زیادہ اعتراضات و جوابات دیتا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ میں نے اعتراض پیدا کرنے کو تو پیدا کر لیا اور جواب نہ دے سکا اور مُلّا بحرالعلوم کا جواب حاشیہ میں موجود ہوتا تو جب تک اُن کے جواب کو رَد نہ کر لیتا کھانا نہ کھاتا۔

جب مدرسہ حنفیہ جون پور سے مولوی عبدالحلیم صاحب لکھنؤ چلے گئے اور اُن کی جگہ پر حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب تشریف لائے تو حضرت ہدایہ پڑھنے کے لیے مفتی صاحب کے پاس تشریف لے گئے، مفتی صاحب نے فرمایا کہ فقیر کا معمول شمس بازغہ کے بعد ہدایہ پڑھانے کا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں شمس بازغہ پڑھ چکا ہوں۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مثل عامی شاگردوں کے پڑھانا چاہا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تین سطروں کا مطالعہ کر کے آیا ہوں۔ میں نے جو باتیں ان تین سطروں میں پیدا کی ہیں اُس کو سُن لیجئے۔ حضرت نے تین گھنٹے تک اُن تین سطروں پر تقریر کی۔ مفتی صاحب دم بخود سُنتے رہے جب حضرت تقریر ختم کر چکے تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ صاحبزادے میں آپ کی ذہانت کی تعریف مولوی عبدالحلیم صاحب سے سُن چکا ہوں۔ جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش تھی تو کوئی ملا نہیں، اب ضعیف ہو چکا ہوں آپ کے پڑھانے کے لائق نہیں رہا اور آپ کو اس کی حاجت بھی نہیں ہے خود کتاب دیکھ جائیے اور دوسروں کو پڑھائیے۔ اگر کہیں کوئی شبہ واقع ہو تو پوچھ لیجئے گا۔

حضرت کی قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو کتاب ایک مرتبہ پڑھ جاتے حفظ ہو جاتی اس بڑھاپے میں وصال سے قبل جب اکثر اوقات استغراق کا غلبہ رہتا تھا جب بھی بعض اوقات اپنے بچپن کے حالات اور واقعات اس طرح بیان فرماتے کہ سب باتیں پیش نظر معلوم ہوتیں۔ ایک بار بچپن میں کسی کی شادی کا ذکر فرما رہے تھے تو ضمن میں شادی کے اخراجات کا ذکر آ گیا تو اس طرح آنے آنے اور پائی پائی کا حساب بیان فرمانے لگے جیسے کوئی فرد حساب دیکھ کر پڑھ رہا ہو۔

حضرت کی شاعری

حضرت پہلے عاصی تخلص فرماتے تھے پھر بعد کو آسی کر دیا۔ شاعری میں حضرت شاہ غلام اعظم صاحب افضل الٰہ آبادی کے شاگرد تھے جو حضرت ناسخ لکھنوی کے ارشد ترین تلامذہ میں سے تھے۔ ناسخ کا شعر ہے ؎

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم   آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

یہ وہی "دائرۂ شاہ اجمل" ہے جہاں کے سجادہ نشین حضرت شاہ غلام اعظم صاحب افضل تھے اور ناسخ شاہ صاحب موصوف ہی کے وہاں تشریف فرما رہتے تھے۔ شاہ صاحب کی شاگردی کا واقعہ ناسخ کے ساتھ حضرت یہ بیان فرماتے تھے کہ جب حضرت ناسخ الٰہ آباد تشریف لائے تو حضرت افضل کی ذہانت

پر عاشق ہوگئے شاہ صاحب موصوف پیشتر ایک میاں جی کے شاگرد تھے جو ہجوگوئی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ماجی صاحب کے خوف سے ناسخ کی ہمت نہ پڑی کہ شاہ صاحب موصوف کو اپنا شاگرد بنائیں۔ چنانچہ ایک روز حضرت ناسخ پانچ روپے کی مٹھائی اور دو سو روپے نقد لے کر میاں جی کے پاس حاضر ہوئے۔ عرض کی کہ میں شاگرد ہونے آیا ہوں۔ میاں جی آدمی بہت مفلس تھے دو سو روپے کی کثیر رقم پاکر بہت خوش ہوئے۔ جب وہ نذرانہ قبول کر چکے تو ناسخ نے دست بستہ عرض کی کہ افضل کو مجھے دے دیجئے۔ میاں جی نے فرمایا کہ "بڑا دھوکا دیا، وہی تو مجھے ایک لڑکا ملا ہے۔" قہرِ درویش برجانِ درویش۔ افضل کو ناسخ کے حوالہ کیا۔

حضرت افضل کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ کبھی مشاعرہ میں پہلے سے غزل نہیں کہتے تھے عین مشاعرہ کے وقت اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور "خانقاہِ اجملیہ" میں دو کاتب دونوں سرے پر بیٹھ جاتے۔ شاہ صاحب ٹہلتے جاتے اور ایک سرے پر پہنچ کر ایک کو شعر لکھاتے، دوسرے سرے پر دوسرے کو۔ اس قدر جلد شعر فرماتے تھے کہ دونوں کاتب بدقت شعر لکھ پاتے۔ بارہا مشاعرہ میں بے غزل کہے ہوئے چلے گئے اور جب باری آئی برجستہ شعر کہنا شروع کر دیا۔ شاہ صاحب کبھی غور کر کے شعر نہیں کہتے تھے۔ ایک مرتبہ ناسخ نے ایک مصرعہ دیا اور فرمایا کہ اس پر غور کر کے مصرعہ لگائیے۔ شاہ صاحب نے دو تین مصرعے غور کر کے لگائے جو اچھے نہیں تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ پابندی مجھ سے نہیں ہو سکتی اور برجستہ پندرہ سولہ مصرعے کہہ گئے جس میں کئی مصرعے لاجواب تھے۔ اس واقعہ کے بعد سے کبھی حضرت ناسخ نے غور کر کے کہنے کی فرمائش نہیں کی۔

حضرت ناسخ کے دورانِ قیام الہ آباد میں کچھ اساتذہ لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ شاہ صاحب کے یہاں مشاعرہ ہوا۔ طرح کی زمین "پتھر چاندنی"، "خنجر چاندنی" تھی۔ لکھنوی حضرات میں سے کسی کے شعر میں "عین" تقطیع سے گر گئی تھی۔ شاہ صاحب نے اُن سے آنکھ ملا کر یہ شعر پڑھا۔

؎ عین بُرقع سے نکالے گر وہ شوخِ نازنیں حسن پر نازاں ہو پھر کیا خاک پتھر چاندنی

ایک مرتبہ جب شاہ صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے تو ناسخ سے اجازت مانگی کہ اگر آپ فرمائیں تو حضرت آتش سے بھی مل آؤں۔ ناسخ نے اجازت دی اور یہ الفاظ فرمائے کہ "دیکھو وہ بڈھا کامل الفن ہے اُس کے کسی شعر پر اعتراض نہ کرنا۔" چنانچہ شاہ صاحب حضرت آتش مغفور کے پاس تشریف لے گئے۔ رسمِ تعارف کے بعد شاہ صاحب نے غزل سنانے کی فرمائش کی۔ آتش نے یہ مطلع پڑھا۔ ؎

حسن سے قدرت خدا کی رُو نظر آیا مجھے ریشِ پیغمبر ترا گیسو نظر آیا مجھے

شاہ صاحب نے لاحول پڑھا آتشؔ خاموش ہو گئے۔ پھر کوئی شعر نہیں سُنایا۔ جب واپس آئے تو ناسخؔ سے قصہ سنایا۔ ناسخؔ نے کہا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ بڈھا کامل الفن ہے اُس پر کوئی اعتراض نہ کرنا۔ حضرت فرماتے تھے کہ شاہ صاحب نے آتشؔ کے شعر کو معشوقانِ مجازی کی تعریف میں سمجھا اس وجہ سے ریشِ پیغمبر کی تشبیہ پر برافروختہ ہو گئے۔ حالانکہ آتشؔ نے امام حسین علیہ السلام کی منقبت میں فرمایا ہے اور ریشِ پیغمبر سے اُن کے گیسو کی مشابہت دی ہے۔ بلاغت کے قاعدہ سے مشبّہ سے مشبّہ بہٖ افضل ہے اس لیے ریشِ پیغمبرؐ کی فضیلت امام حسین علیہ السلام کے گیسو پر باقی رہی۔ شعر اپنی جگہ پر بے مثل ہے۔

حضرت جب شاہ غلام اعظم صاحب کے شاگرد ہوئے تو ابتدا میں چند غزلوں پر اصلاح پڑی۔ جب شاہ صاحب کے کُل اصول و قواعد حضرت کو معلوم ہو گئے تو پھر اصلاح نہیں پڑتی تھی مگر حضرت ادباً اپنی غزلیں شاہ صاحب کے پاس بھیجتے رہے۔ شاہ صاحب یہی لکھ کر واپس کر دیتے کہ کہیں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔ شاہ صاحب موصوف صفائے دلی کی وجہ سے بہت زود رنج بھی تھے مگر فوراً ہی دل صاف بھی ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت نے طرح بھیجی تھی جس کا قافیہ ردیف "مکان پر، امتحان پر" تھا۔ شاہ صاحب سے کسی نے یہ کہا کہ حضرت آسیؔ نے یہ طرح آپ کے پاس امتحان کے لیے بھیج دی ہے۔ چنانچہ جب حضرت نے اپنی غزل اصلاح کے لیے بھیجی تو شاہ صاحب نے بغیر کچھ لکھے ہوئے واپس کر دی۔ حضرت صاحب سمجھ گئے کہ کسی دراندازنے کچھ لگا دیا ہے اور شاہ صاحب خفا ہو گئے ہیں چنانچہ جب ملاقات ہوئی تو شاہ صاحب کا دل صاف ہو گیا۔ اسی واقعہ کا اشارہ شاہ صاحب کے ایک مطلع میں موجود ہے ؎

احباب مستعد ہیں مرے امتحان پر　　پہنچے گی اس غزل کی زمین آسمان پر

اسی میں شاہ صاحب کا شعر ہے ؎

پہنچا ہے عرش پر تنِ خاکیِ مصطفےٰ　　کس شان سے زمین گئی آسمان پر

حضرت فرماتے تھے کہ اب اس سے بہتر کوئی زمین آسمان پر نہیں جاسکتی۔

شاہ صاحب کی ذہانت کے متعلق ایک واقعہ بیان فرماتے تھے کہ گرمیوں کا زمانہ تھا شدت کی دھوپ، لُو زوروں سے چل رہی تھی، دوپہر کا وقت، شاہ صاحب گرمی سے بدحواس "خانقاہِ رشیدیہ جون پور" میں تشریف لائے۔ حضرت سے فرمایا "پانی لاؤ، پنکھا لاؤ۔ پانی لاؤ، پنکھا لاؤ۔" حضرت نے فرمایا "ایک انملی کہہ دیجئے"۔ شاہ صاحب نے فرمایا، "یہ کون سا وقت ہے، گرمی سے بدحواس ہوں، پانی لاؤ، پنکھا لاؤ"۔ حضرت نے فرمایا: "یہی تو امتحان کا وقت ہے"۔ شاہ صاحب

نے کہا، "اچھا کہو کہو جلدی کہو"۔ حضرت نے فرمایا۔ "چیونٹی، حقہ، علیل، چونا"۔ حضرت کے منہ سے جونہی الفاظ ختم ہوئے تھے کہ شاہ صاحب نے برجستہ فرمایا ؂

ہڈی پس چونا بھیو چل گیو ایسو گلیل   کہہ دو ہکا باج سے چیونٹی اور دلیل

ایک مرتبہ شاہ صاحب موصوف جون پور تشریف فرما تھے۔ حضرت کا معمول تھا کہ عصر کے بعد شہر کے باہر مع اپنے چند ہم سبق احباب کے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک روز شاہ غلام اعظم صاحب اور مرزا رحمت اللہ بیگ جو بنارس کے مشہور وکیل گزرے ہیں، اس زمانہ میں وہ بھی حضرت کے ہم سبق تھے اور شاہ صاحب موصوف کے ایک عزیز جو رشتے میں شاہ صاحب کے سالے ہوتے تھے اور بھی دو ایک آدمی ہمراہ تھے، جب پُل کے قریب پہنچے تو کھٹکنیں امرود بیچ رہی تھیں۔ شاہ صاحب کی شاعری وہیں سے شروع ہوگئی۔ "امرود کی گولی، نمرود کی گولی"۔ یہ زمین تھی، کئی میل تشریف لے گئے اور واپس آئے شاہ صاحب اس طرح برجستہ اشعار پڑھتے جاتے تھے جیسے کسی کو حفظ ہوں۔ ردیف یہی باقی رہی قافیہ البتہ بدلتے جاتے تھے۔ ہر شعر میں جو رشتہ میں شاہ صاحب کے سالے ہوتے تھے ان پر کوئی نہ کوئی چوٹ ضرور ہوتی تھی۔ واپسی میں جب خانقاہ کے دروازے پر پہنچے ہیں تو اس شعر پر جس کا مصرعہ یہ ہے شاعری ختم ہوئی۔ ع

"چھاتی میں لگی ہے تری ہمشیر کی گولی"

شاہ صاحب موصوف کو علاوہ اور کمالاتِ ظاہری و باطنی کے اشیائے گم شدہ یا مسروقہ کے انکشاف میں بھی یدِطولیٰ تھا۔ اُن کے ایک دوست کی خاکِ شفا کی تسبیح گُم ہوگئی تھی۔ چند احباب بیٹھے ہوئے تھے، تسبیح کے گم ہونے پر ذکر چلا۔ انہوں نے شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ میری تسبیح کون چُرا لے گیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ "اگلے واقعات بھی بیان کروں یا گزشتہ؟" پھر فرمایا کہ "اگلے کی تصدیق کے لیے وقت درکار ہوگا، گزشتہ سُنو! تم کو ایک ایسے شخص کا عشق ہوگیا تھا کہ اگر یہ راز فاش ہوتا تو تمہاری جان کے لالے پڑ جاتے۔ تم کو چین نہ تھا۔ ایک روز جوشِ وحشت میں صحرا کی طرف تم چل کھڑے ہوئے شام کا وقت تھا۔ فلاں بنسواڑی کے پاس تم کو کچھ ہیبت سی محسوس ہوئی۔ وہاں سے گھبرا کر تم نے گھر کا راستہ لیا، فلاں مقام پر تم کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ تم نے پیشاب کیا، تسبیح اسی جگہ گر پڑی تھی۔ اُس کے بعد ہی فوراً آندھی آئی اور خس و خاشاک اُس تسبیح پر جم گئی۔ تم اُس بدحواسی میں جب مکان پر پہنچے۔ چوکھٹ سے ٹھوکر لگی اور تمہارے پاؤں کی نلی میں سخت چوٹ آئی اور زخم ہوگیا اُس کا نشان اب تک موجود ہے۔ یہ کہہ کر شاہ صاحب نے ان کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ دیکھ لو اُس

کا نشان اب تک موجود ہے۔ انھوں نے گھبرا کر اپنا پاؤں چھپالیا۔ تمہاری تسبیح اب تک اسی جگہ موجود ہے جا کر لے آؤ۔ وہ گئے اور جا کر لے آئے۔ سب لوگ دنگ رہ گئے۔

حضرت شاہ غلام اعظم صاحب افضل قدس سرّہٗ کے وصال کے بعد حضرت نے ان کو خواب میں دیکھا کہ مجھ کو اپنا قلم دان عطا فرمایا۔ حضرت نے یہ خواب شاہ صاحب موصوف کے صاحب سجادہ برادرِ نسبتی حضرت شاہ سید محمد بشیر قدس سرّہٗ سے بیان فرمایا۔ جناب شاہ سید محمد بشیر صاحب نے فرمایا کہ بھائی صاحب نے اپنا قلم دان آپ کو عطا فرمایا ہے تو اب میرے لیے بجائے بھائی صاحب کے آپ ہیں اور اپنا کلام حضرت کو دکھاتے رہے۔ حضرت شاہ محمد بشیر صاحب خود کامل الفن اور درویش کامل تھے اصلاح کی ضرورت نہیں رہتی تھی مگر محض اپنی بے نفسی اور حضرت صاحب کی دوستی اور محبت سے ایسا کرتے تھے۔

حضرت کے تلامذہ

حضرت مولانا آسی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی جن میں مولوی عبدالاحد صاحب شمشاد لکھنوی، مولوی عبدالصمد صاحب رئیس وکیل غازی پوری، حکیم مولوی سید محمد غازی پوری مولوی احمد حسین لبیب سکندر پوری بہت ممتاز تھے۔ حضرت شمشاد کے بارے میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان کو ناسخ سے افضل نہ سمجھو تو ان سے کم بھی نہ سمجھو۔ لبیب سکندر پوری کے بارے میں فرماتے تھے کہ واقعی اسم بامسمّٰی تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے زبردستی منبر پر بٹھلا دیا اور مجبور کیا کہ مرثیہ پڑھو۔ لبیب نے حضرت کی ایک غزل میں ایک ایک دو دو لفظ کی تبدیلی کر کے برجستہ سلام پڑھ دیا۔ غزل کا مطلع یہ تھا۔ ؎

قصرِ دل میں جب کسی دن آپ کا آنا ہوا — یہ ہوئی رفعت کہ بامِ عرش تہ خانہ ہوا

لبیب نے یوں پڑھا ؎

مجرئی جب قصرِ دل میں شاہ کا آنا ہوا — یہ ہوئی رفعت کہ بامِ عرش تہ خانہ ہوا

ایک مرتبہ لوگوں نے تعزیہ کے جلوس کے ساتھ لبیب کو مجبور کیا کہ مرثیہ پڑھو۔ لبیب نے فی البدیہہ حضرت کی غزل پر مخمس کے طور پر مصرعہ لگا کے مرثیہ پڑھ دیا۔

حکیم سید جعفر حسین کاشف لکھنوی جو حضرت رشک مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حکیم محمد اسحٰق صاحب حاذق موہانی حضرت کے خاص احباب میں سے تھے۔ حکیم محمد اسحٰق موہانی کا یہ شعر اکثر کیفیت میں پڑھا کرتے تھے۔ ؎

جمالِ شاہدِ خلوت گہِ غیب — چو برزد پردہ سرزد روئے احمدؐ

اُن کے دیوان "مدینۂ نعمت" کے بارے میں فرماتے تھے کہ حضرت شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیہ اپنی آنکھوں سے لگاتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ دیوان دربار رسالت میں مقبول ہو چکا ہے۔ حکیم محمد اسحٰق صاحب کے بارے میں فرماتے تھے کہ ہندوستان میں اوّل نمبر کا نسخہ آپ کا ہوتا ہے اس کے بعد میرا۔ حضرت کی طبابت کا یہ حال تھا کہ بارہ سو پندرہ سو آدمیوں کا مجمع مطب میں ہوا کرتا تھا۔ اشراق کے بعد مطب میں بیٹھا کرتے تھے اور ظہر کے وقت فرصت ملتی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے نبض دیکھتے جاتے تھے اور چار چار کاتب نسخہ لکھتے جاتے تھے۔ ہندوستان بھر سے جو مریض مایوس ہو کر حضرت کے پاس آتے تھے چند روز میں شفایاب ہو کے خوشی خوشی واپس جاتے تھے۔ یہ بھی خصوصیت تھی کہ حضرت فیس نہیں لیتے تھے۔ ایک مریض آیا جس کے بائیں شانہ اور بازو میں درد رہا کرتا تھا دہلی میں حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم محمود خاں وغیرہ اور لکھنؤ میں بھی مشاہیر اطبار کا علاج کر چکا تھا۔ کوئی افاقہ کی صورت ظاہر نہیں ہوئی۔ حضرت فرماتے تھے کہ میں نے نسخے دیکھے تو درد کے جتنے اسباب تھے سب پر نسخے موجود تھے۔ میں غور میں ہوا اور میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مثانہ میں ریگ ہے جس کے ابخرے وہاں درد پیدا کر رہے ہیں۔ میں نے اخراجِ رمل کا چار پانچ پیسوں کا نسخہ لکھا اور کہا کہ پی کر چینی کے پیالہ میں پیشاب لاؤ صبح کو وہ پیشاب لائے تو ریگ کافی مقدار میں نکلی تھی۔ ایک ہی خوراک میں درد جاتا رہا۔ اخراجِ رمل کے بعد تقویتِ گردہ کی دوائیں دیں اور وہ بالکل اچھے ہو گئے۔ اسی طرح ایک اور مریض آیا جو ہر جگہ سے مایوس ہو چکا تھا۔ اُس کے دست کسی طرح بند نہیں ہوتے تھے۔ انسباب نزلہ معدہ پر تشخیص کیا اور پُشتِ گردن پر ضماد کا نسخہ لکھ دیا۔ ضماد لگانے کے بعد دست بند ہو گئے، پھر اُس کے دماغ کا علاج کیا وہ اچھا ہو گیا۔

حکیم محمد اسحٰق صاحب کا جو نسخہ مجرب نکلتا تھا وہ اُس کی نقل حضرت کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور حضرت کا جو مجرب نسخہ نکلتا تھا وہ حکیم صاحب کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب سے جب کوئی کہتا تھا کہ حضرت آسیؔ نے نہ تو کسی سے طب پڑھی نہ کسی کے مطب میں بیٹھے اور شفا کا یہ حال ہے کہ جو مریض اُن کے ہاتھ میں آیا وہ آناً فاناً صحت یاب ہوا تو وہ فرماتے کہ ارسطو اور بوعلی سینا کو کس نے طب پڑھائی تھی؟ یہ اُن دماغ کے لوگوں میں ہیں جو طب ایجاد کریں، اُن کو استاد کی کیا ضرورت ہے؟ حضرت کا قول تھا کہ جس نے علومِ عربیہ پڑھے اور اس قابل نہ ہوا کہ دوسروں کو طب پڑھا سکے تو اُس نے خاک نہیں پڑھا۔ حضرت کی طبابت کا واقعہ یہ ہوا کہ حکیم سید جعفر حسین کاشفؔ لکھنوی جب کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ جانے

لگے تو اپنے شاگردوں کو حضرت کے سپرد کر گئے کہ ان کو طب پڑھا دیا کیجیے۔ حضرت فرماتے تھے کہ میں شب کو مطالعہ کیا کرتا اور صبح کو درس دیا کرتا تھا۔ جب حکیم صاحب واپس آئے تو کوئی شاگرد اُن کے پاس جانے کو تیار نہیں ہوا۔ جب شاگردوں کا درس ختم ہوا میں نے مطب شروع کر دیا۔ حضرت کاشف اور حضرت آسی میں اتنی محبت اور یگانگت تھی کہ مشاعرہ کے قبل ایک دوسرے کو غزل دکھا دیا کرتے تھے۔ حضرت فرماتے تھے کہ حکیم صاحب نے کبھی میرے کسی شعر میں ترمیم نہیں کی میں کبھی کبھی جو ترمیم مناسب ہوتی تھی کر دیا کرتا تھا۔ مشاعروں میں حضرت سب کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ حضرت کے شعر سُننے کے ساتھ جو لوگ واہ وا کرنے لگتے تو حکیم صاحب بہت خفا ہوتے۔ فرماتے کہ "کیا واہ وا، کیا سمجھے"؟ حکیم صاحب شعر سُن کے چند منٹ غور کرتے، جب فرماتے کہ اب واہ وا کرو۔ حکیم صاحب موصوف پر حضرت کی صحبت کا رنگ ایسا غالب آگیا تھا کہ ان دونوں بزرگوں کے کلام میں امتیاز دشوار تھا۔ افسوس کہ اہلِ لکھنؤ نے ایسے سرمایۂ ناز اُستاد کی قدر نہ کی اور اُن کا دیوان زیورِ طبع سے اب تک محروم ہے۔ حکیم صاحب کا کلام مولوی سُبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور کے پاس حکیم صاحب کے قلم کا لکھا ہوا محفوظ ہے اور نقل خاکسار کے پاس بھی ہے۔ حضرت اور حکیم کاشف صاحب ناسخ اور رشک کے جملہ قواعد کے سختی سے پابند تھے بلکہ حضرت آسی کے یہاں "کا" کا الف بھی دبنا ناجائز تھا۔ شاہ غلام اعظم صاحب افضل الٰہ آبادی نے ایک رسالہ ناسخ اور رشک کے قواعد کے مطابق تصنیف کیا تھا۔ حضرت کے پاس دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ حضرت نے قواعد میں کچھ اور سختیاں بڑھا دی تھیں۔ حضرت نے یہ رسالہ اپنے دلی دوست میر مبارک حسین عرف میر محمد جان صاحب المتخلص بہ صدق کے پاس جو حضرت کے اُستاد بھائی تھے، بھیج دیا تھا۔ میر صاحب موصوف کے پاس وہ رسالہ رہ گیا اُن کے بڑے صاحبزادے میر سید ضامن علی صاحب سے میں نے دریافت کیا تھا اُن سے معلوم ہوا کہ اُس کا پتہ نہیں ملتا معلوم نہیں کیوں کر ضائع ہوا۔

حضرت کے قواعد پر مولوی شمشاد مرحوم پورے طور پر پابند تھے مگر "کا" کے الف کے نہ دبنے میں وہ بھی نہ چل سکے۔ اُن کے پہلے دیوان کے طبع کی تاریخ میں حضرت نے "کا" کے الف کے دبنے کی طرف بہت لطیف کنایہ میں اشارہ کیا ہے تاریخ کا ایک شعر جس میں وہ کنایہ ہے یہ ہے ؎

بہت قیدوں میں جکڑا میں نے لیکن — وہ زور آور روش آزاد دیکھی

مادۂ تاریخ یہ ہے: "بہارِ گلشنِ شمشاد دیکھی"۔

مولوی شمشاؔد صاحب پہلے قلقؔ لکھنوی کے شاگرد تھے اور حضرت قلقؔ مرحوم نے اُستادی کی سند بھی دے دی تھی۔ پہلے اُن کا دیوانِ اوّل قلقؔ کا اصلاح شدہ تھا۔ حضرت تپ ولرزہ میں مبتلا تھے۔ مولوی شمشاؔد صاحب ایک غزل حکیم کاشفؔ صاحب کی وساطت سے لے کر حاضر ہوتے۔ وہ غزل قلقؔ کی اصلاح شدہ تھی۔ حضرت نے اُسی حالتِ علالت میں اصلاح دی مولوی شمشاد صاحب اس اصلاح سے ایسے گرویدہ ہوئے کہ فوراً شاگردی کی درخواست کی۔ حضرت نے دیوانِ اوّل اپنے خاندان کے اصول وقواعد کے مطابق شروع سے آخر تک بنایا۔ مولوی صاحب کے خسُر مولوی رحمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کے نام سے مدرسہ چشمۂ رحمت کالج غازی پور میں اب تک باقی ہے حضرت کے بہت بڑے دوست تھے۔ مولوی شمشاؔد صاحب کی بے نفسی کا واقعہ ملاحظہ ہو۔ مولوی صاحب حسبِ معمول بعدِ مغرب تشریف لائے اور بہت سے عمائدینِ غازی پور حضرت کی خدمت میں حاضر تھے۔ مولوی صاحب نے ایک نئی غزل حضرت کو سنائی، مولوی صاحب سے چپکے سے میں نے عرض کی کہ فلاں شعر کی ردیف میں مجھ کو اشتباہ ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ صحیح تو معلوم ہوتی ہے۔ میں نے عرض کی میری تشفی نہیں ہوتی، مولوی صاحب نے فرمایا کہ حضرت سے پوچھوں؟ میں نے عرض کی پوچھئے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ۔ حضرت! اس شعر کی ردیف کیسی ہے؟" حضرت نے فرمایا محاورہ سے گر گئی ہے۔ مولوی صاحب نے باآوازِ بلند یہ اعلان کیا کہ مجھ سے چُوک ہو گئی تھی میاں شاہد نے اصلاح دی میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ ایک بار اور ایسا ہی واقعہ ہوا اور پھر مولوی صاحب نے اس کا اعلان کیا۔ اس کے بعد میں نے توبہ کی کہ پھر کبھی ایسی گستاخی نہ کروں گا مگر اس کے بعد مولوی شمشاؔد صاحب کا معمول یہ تھا کہ جتنی غزلیں کہتے اُس کو محفوظ رکھتے جب میں غازی پور حاضر ہوتا تو مجھ سے فرماتے کہ تمہاری نگاہ بہت تیز ہے اس کو دیکھ جاؤ اگر مجھ سے کوئی چُوک ہوئی ہو تو بتاؤ۔ جب تک میں نہ دیکھ لیتا کسی کو غزل نہ سُناتے۔ میں مولوی صاحب مرحوم کے کم ترین شاگردوں میں تھا، مگر جو اُن کی شفقت اور کرم اِس گنہ گار پر تھا اُس کو میرا دل ہی جانتا ہے۔

حضرت صفیرؔ بلگرامی جو مومنؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ڈُمراؤں راج ضلع آرہ میں رہتے تھے۔ ڈُمراؤں راج غازی پور سے قریب ہے۔ غازی پور کے مشاعروں میں، شریک ہوتے تھے حضرت سے چشمک رہا کرتی تھی۔ ان کی طرف سے ایک طرح دی گئی جس کی زمین "آتے ہیں کیوں، جاتے ہیں کیوں" تھی۔ حضرت کے پاس مصرعہ طرح غلط بھیجا گیا اور زمین "آتا ہوں کیوں، جاتا ہوں کیوں" بتائی گئی۔ حضرت جب مشاعرہ میں پہنچے تو غلط طرح پہنچنے کا علم ہوا۔ یہ حرکت

گراں گزری اور جب شمع سامنے آئی تو یہ رباعی پڑھی۔

وہ ذکر کروں کہ خود فراموش ہوں میں ؛ کوئی نہ سُنے پر ہمہ تن گوش ہوں میں
پائی ہے زباں لوز کی شمع کی طرح ؛ اندھیر ہو محفل میں جو خاموش ہوں میں

اور جو غزل گھر سے غلط طرح میں کہہ کر لے گئے تھے اس کو غیر طرح کر کے پڑھ دی جس کا مقطع یہ ہے

طرح کا مصرع ہوا ہے جمع کے صیغے کے ساتھ ؛ میں غزل مفرد میں اے آسی پڑھے جاتا ہوں کیوں

اور اسی پرچہ کو اُلٹ کے جس پر یہ غزل درج تھی سادہ صفحہ ہاتھ میں لے کر برجستہ طرح میں غزل سنانی شروع کر دی جس میں کہیں کہیں اپنے مخالفین پر چوٹ بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو

شمع کے مانند ہے اپنا بھی کیا سوز و گداز ؛ صورتِ پروانہ دشمن ہم سے جل جاتے ہیں کیوں

غزل پڑھتے چلے جاتے تھے، حضرت کاشفؔ نے فرمایا کہ "کیا دیوان آج ہی ختم کر دیجئے گا"؟ تو مقطع پڑھ دیا۔ اس غزل کے کُل اشعار دستیاب نہیں ہوئے، جتنے مل سکے وہ دیوان میں درج ہیں۔

ایک بار صفیرؔ بلگرامی کی طرف سے طرح دی گئی جس کی زمین تھی "آتے کیوں ہو، جاتے کیوں ہو"۔ اس زمین میں مومنؔ کا ایک شعر ہے

کھول دو وعدہ کہ تم پردہ نشیں ہو نہ وصال ؛ اپنی زلفوں کی طرح بات بناتے کیوں ہو

اس شعر میں وعدہ کھولنا خلاف محاورہ ہے اور وصال کی پردہ نشینی بھی محلِ کلام ہے، حضرت کی غزل کا مطلع ہے

تم نہیں کوئی تو سب میں نظر آتے کیوں ہو ؛ سب تمہیں تم ہو تو پھر منہ کو چھپاتے کیوں ہو

غزل پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہنچے تو صفیرؔ صاحب سے آنکھ ملا کر فرمایا کہ دیکھئے محاورہ یوں نظم کرتے ہیں۔ اشارہ یہ تھا کہ مومنؔ محاورہ نظم کرنا چاہتے تھے، نظم نہیں کر سکے۔ شعر یہ ہے؛

تم پری زاد ہو وعدہ تو پری زاد نہیں ؛ آپ اُڑتے ہو اُڑو بات اُڑاتے کیوں ہو

صفیرؔ صاحب کے منہ پر ہوائی اڑنے لگی۔ ایک بار اور صفیرؔ صاحب کی طرف سے طرح دی گئی جس کی زمین تھی "خبر سے، نظر سے" سب کے آخر میں حضرت غزل پڑھا کرتے تھے۔ صفیرؔ صاحب غزل پڑھ چکے تھے، حضرت نے جب یہ مطلع پڑھا

اب حاجتِ روزن نہ غرض رخنۂ در سے ؛ منہ اُس نے نکالا ہے یہاں چاکِ جگر سے

حضرت کاشفؔ بے تاب ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ اب تک تو ایسا مطلع نہیں سُننے میں آیا ہے۔ صفیرؔ صاحب کا منہ سُوکھ گیا۔ حضرت نے فرمایا آپ کی طرف سے کئی طرحیں ہو چکیں

میری طرف سے بھی ایک طرح پیش ہوتی ہے۔ اس میں غزل کہیئے۔ صفیرؔ صاحب مشاعرہ سے چند گھنٹہ قبل بلگرام روانہ ہو گئے۔ مومنؔ کا شعر ہے ؎

حُسنِ روز افزوں پہ غرّہ کس لیے اے ماہ رو ٭ یوں ہی گھٹتا جائے گا جتنا کہ بڑھتا جائے ہے

حضرت نے بھی اسی مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

اگر شورِ شباب اتنا ہوا اس کا تکبّر کیا ٭ گجر ہے دوپہر کا آفتابِ حُسن ڈھلتا ہے

ذوقؔ کا شعر ہے ؎

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند ٭ جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج

اوّل تو ابر سے فرشتوں کی راہ بند نہیں ہوتی۔ دوسرے گنہ کا ثواب ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت نے کیا خوب مصرعہ لگایا ہے ؎

جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج ٭ کیسی بارش ہے ابرِ رحمت کی

حضرت کے مخلص دوست میر محمد جان صاحب صدقؔ سے ایک عرصہ کے بعد ریل میں ملاقات ہوئی تو فی البدیہہ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ ایک مصرعہ حضرت کہتے تھے اور ایک مصرعہ حضرت صدقؔ۔ اسی طرح ایک غزل تیار ہو گئی۔ جس کا مطلع درجِ ذیل ہے۔ حضرت فرماتے تھے کہ ایک مصرعہ میرا ہے اور ایک حضرت صدقؔ کا۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرا مصرعہ کون سا ہے ؎

کاہے کو تھی اُمیدِ رہائی فراق سے ٭ صحبت یہ ہاتھ آئی ہے آج اتفاق سے

یونہی کُل غزل تھی۔ صحرائے ختن کی مُشک بوئی کی تعریف تمام شعراء نے کی ہے۔ صحرا کی مشک بوئی محض خیالی ہے اس لیے کہ جب تک مُشک زندہ غزال کے نافہ میں رہتا ہے خوشبو باہر نہیں پھیلتی۔ حضرت نے صحرائے سکندر پور کی تعریف جس خوبی سے کی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ سکندر پور کے اطراف میں گلاب، جوہی، چنبیلی اور بیلے کی کاشت ہوتی ہے اور دریائے گھاگھرا بھی قریب ہے۔ حضرت کا شعر ملاحظہ ہو ؎

پرتوِ عارض ہے دریا نور کا ٭ زلف صحرا ہے سکندر پور کا

ایک فارسی کے شعر میں اپنا تخلص نظم کیا ہے۔ فرماتے تھے کہ اس سے بہتر تخلص پھر نظم نہ ہو سکا، شعر یہ ہے ؎

نیستم فارغ از سفر بہ وطن ٭ آسیا شکلِ آسیا شدہ ام

حضرت نے ایک قصیدہ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کی مدح میں کہا تھا حضرت بیان فرماتے تھے کہ میں تپ ولرزہ میں مبتلا تھا۔ شب کو جب لحاف اوڑھ کے سونے کے

لے لیتا تھا تو یہ قصیدہ کہتا تھا۔ صبح کو جو اشعار یاد رہ جاتے تھے اُسے لکھ لیتا تھا جو بھول جاتے تھے وہ بھول جاتے تھے۔ قصیدہ جب تمام ہوا تو میں نے اپنے پیرو مُرشد کو سُنایا۔ انہوں نے فرمایا "کیا فضول کہا"۔ بات ہوگئی اور اس جملہ کا معمہ اُس وقت سمجھ میں نہ آیا۔ مولوی عبدالصمد صاحب نے حضرت سے اُس کا مسودہ لے کر نہایت خوشخط اور مُطلّا و مذہّب کرا کے حضرت کی طرف سے رام پور بھیج دیا اور حضرت سے باصرار ایک خط منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے نام لکھوایا وہ قصیدہ وہاں پہنچا حضرت امیر مینائی نے پیش نہ ہونے دیا اور اُس کو واپس کر دیا اور حضرت کے خط کے جواب میں جو خط لکھا اُس میں حضرت کی تعریف میں اپنا قلم توڑ دیا۔ عذر یہ لکھا کہ آپ کا قصیدہ واپس ہونے کے بعد مجھے آپ کا خط ملا۔ حالانکہ جس تاریخ کو قصیدہ وہاں سے روانہ ہوا تھا اُسی تاریخ کی ڈاک کی مہر حضرت امیر کے خط پر بھی تھی۔ ناظرین نے "مکتوباتِ امیر مینائی" ملاحظہ فرمائے ہوں گے مگر جو عبارت کی رنگینی منشی جی کے قلم سے نکلی ہے وہ اور تحریروں میں نہ پائیں گے۔ اس خط کی نقل درج کرتا ہوں' اتفاق سے حضرت کے وصال کے بعد خانقاہ کی ردّیوں میں حضرت امیر مینائی کا وہ خط مجھے ملا، میں نے اس کا فوٹو بھی لے لیا ہے جس کا عکس اگلے صفحہ پر درج ہے۔ میں نے اصل خط حضرت ریاض اور حضرت وسیم مرحومین کو دکھایا تھا اُن لوگوں نے تصدیق کی تھی کہ یہ تحریر اُن کے بھائی کے ہاتھ کی ہے۔

حسن [illegible] اسکا نام نہیں کہ [illegible] — مگر [illegible]
تو [illegible] کی بحث کیا [illegible] — نہ اور [illegible]
دکھائی [illegible] — [illegible] دل [illegible] دیکھ جان [illegible]
— بعد حضرت موسیٰ نے تو [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible]
ہوگا — بحمد اللہ [illegible]
اور [illegible] — غرض [illegible]
[illegible] — [illegible]

مولوی عبدالصمد صاحب کو قصیدہ کا نہ پیش ہونا گراں گزرا اور انہوں نے وہ قصیدہ جنرل عظیم الدین خاں مدار المہام ریاست رام پور کے پاس جو مولوی صاحب موصوف کے مخلص دوست تھے بھیجا اور اُن کو یہ لکھا کہ آپ اس کو موقع سے پیش کیجئے۔ چھ مہینے کے بعد جنرل صاحب موصوف نے وہ قصیدہ مولوی عبدالصمد صاحب کے پاس واپس کیا اور لکھا کہ جب پیش کرنے کا قصد کرتا ہوں تو نواب صاحب کی طبیعت ناساز ہو جاتی ہے۔ نواب صاحب کے ایک چچا جو بریلی میں رہتے تھے وہ بیمار ہوئے۔ حکیم سید جعفر حسین صاحب کاشف لکھنوی غازی پور سے اُن کے علاج کے لیے بلائے گئے۔ نواب صاحب اپنے چچا کو دیکھنے کے لیے ہر سنیچر کو بریلی آیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب نے وہ قصیدہ حضرت سے باصرار مانگ لیا اور فرمایا کہ میں خود اس قصیدہ کو جب نواب صاحب بریلی آئیں گے تو پیش کروں گا اور مخالفوں سے داد لوں گا۔ خدا کی قدرت کہ حکیم صاحب بریلی پہنچے مگر سنیچر سے پہلے ہی نواب صاحب کے چچا کا انتقال ہو گیا اور نواب صاحب بریلی نہیں تشریف لائے قصیدہ واپس آیا۔ اس کے بعد حضرت کے پیر و مرشد نے پوچھا "حلیم! اُس قصیدہ کا کیا حشر ہوا؟" حضرت نے کُل واقعات عرض کئے۔ فرمایا کہ "مجھے اُسی وقت ناگوار ہوا تھا کہ اِن سگانِ دنیا کی تعریف میں کہا ہے"۔ حضرت فرماتے تھے کہ اس "کیا فضول کہا" کا مطلب اُس وقت سمجھ میں آیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ میں ایک قصیدہ نواب حیدر آباد کی تعریف میں کہہ رہا تھا۔ اُسی زمین میں سوداؔ کا بھی قصیدہ نواب حیدر آباد کی تعریف میں کلیاتِ سودا میں موجود ہے۔ اس قصیدہ پر سوداؔ کو ایک لاکھ روپے نقد اور بہت سے انعام و اکرام ملے تھے۔ میرا دعوٰی یہ تھا کہ اگر میرا قصیدہ سوداؔ کے قصیدہ سے بڑھ جائے تو کم سے کم اتنا انعام تو ملے جتنا سوداؔ کو ملا تھا۔ بڑے حضرت یعنی حضرت کے پیر و مرشد کے اس فرمانے کے بعد میں نے اس قصیدہ کو ناتمام چھوڑ دیا اور پھر کبھی کسی اہلِ دنیا کی مدح نہ کی۔ حیدر آباد والے قصیدہ کے کُل اشعار نہ مل سکے جس قدر ملے دیوان میں شامل کئے گئے۔ حضرت فرماتے تھے کہ ہم لوگوں کی زبان (ہم لوگوں سے مراد حضرت کاشفؔ اور دیگر استاد بھائی اور شاگرد تھے) دوسروں سے الگ ہے۔ ہم لوگ دو حرفوں کے مخارج میں ثقالت کا خاص خیال رکھتے ہیں مثال کے طور پر حضرت آتشؔ کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

؎ کیا دیجئے گا عاشقِ دل گیر کا جواب ؎ خاموشی کے سوا نہیں تقصیر کا جواب

یہاں "دیجئے گا عاشق" میں گاف کے بعد عین کا مخرج ہمارے خاندان کے قواعد کے رُو سے قابلِ احتراز ہے اور خاموشی فارسی لفظ ہے۔ اس کی "ی" کا گرنا جائز نہیں۔ آتشؔ کے خاندان میں جائز ہے۔ میں کہتا تو اس طرح کہتا ؎

کیا دیں گے آپ عاشقِ دل گیر کا جواب ؎ چُپ رہنے کے سوا نہیں تقصیر کا جواب

حضرت وزیرؔ کے شعر پر جناب آتشؔ کی اس اصلاح کے بارے میں بھی ؎

جو کہ طائر ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے ؛؛ اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہُما ہوتا ہے

فرماتے تھے کہ میں کہتا تو یوں کہتا ؎

جو پرندہ ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے ؛؛ اے شہِ حُسن وہ چھُٹتے ہی ہُما ہوتا ہے

میرا ارادہ تھا کہ حضرت کے مشکل اشعار کی شرح بھی لکھ کے اس میں شامل کروں مگر افسوس کہ وقت نے مساعدت نہیں کی۔ کہیں کہیں تلیح طلب اشعار بھی ہیں مثلاً

پُل بھی ہے فخرِ جون پور آسی ؛؛ خواب گاہِ جنابؒ شیخوؒ ہے

حضرت شاہ شیخو مجذوب سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگ تھے اور قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد رشید جون پوریؒ صاحبِ خانقاہِ رشیدیہ ومصنف "مناظر رشیدیہ" کے دوست اور معاصر تھے۔ جون پور کا پُل جو اپنے استحکام کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا اُنہی کی دعا سے بنا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ اکبر بادشاہ جون پور دورہ پر آیا ہوا تھا۔ شام کو دریا کی سیر کے لیے کشتی پر نکلا۔ دریائے گومتی بہت جوش پر تھا۔ دیکھا کہ ایک عورت دریا کے کنارے بیٹھی رو رہی ہے۔ دریافت کیا تو اُس عورت نے کہا کہ میں اپنا شیر خوار بچہ اُس پار چھوڑ کر شہر میں کچھ ضرورت سے آئی تھی، اب کھیوا بند ہو گیا ہے میرا بچہ رات بھر بغیر دودھ کے تڑپ کر مر جائے گا۔ اکبر نے اپنی کشتی پر اُس عورت کو اُس پار اتار دیا اور منعم خاں خانخاناں کو حکم دیا کہ اس جگہ پُل بنواؤ۔ منعم خاں خانخاناں نے کاریگروں کو بُلوا کے پُل بنانے کا حکم دیا۔ کاریگروں نے کہا کہ اس جگہ بہت کُنڈ ہے یہاں پُل نہیں بن سکتا۔ کچھ ہٹ کے پُل بن جائے گا۔ خانخاناں نے کہا کہ بادشاہ نے مجھ کو اس جگہ پُل بنانے کا حکم دیا ہے، اگر یہاں نہ بنا تو میری بڑی ذلت ہوگی۔ کاریگروں نے کہا کہ اس کُنڈ کو روپوں سے پاٹیے۔ جب پُل بنے گا۔ مقصود یہ تھا کہ بہت کثیر روپیہ خرچ ہوگا۔ خانخاناں آمادہ ہو گئے۔ پہلے کاریگروں نے خشکی میں پانچ طاق کا ایک پُل بنایا اور دریا کو کاٹ کر اُس طرف لے گئے پھر بھی اُس جگہ پل نہ بن سکا۔ عاجز آ کر کاریگروں نے جواب دے دیا۔ منعم خاں خانخاناں خود ٹوپی سی کر اُس کی قیمت سے روٹیاں کھاتے تھے۔ اس مالِ حلال میں سے دو چار روپے اُن کے پاس موجود تھے اُنہی روپوں سے اولیاء اللہ جون پور کی دعوت کی۔ چونکہ یہ مال طیّب تھا اولیاء اللہ نے دعوت بلا عذر قبول کر لی۔ کھانا کھانے کے بعد خانخاناں نے دست بستہ عرض کیا کہ آپ لوگ دعا فرمائیں کہ اس جگہ پُل تیار ہو جائے۔ حضرت شاہ شیخو مجذوب نے دعا کی، بقیہ اولیاء اللہ نے آمین کہی۔ اس کے بعد کاریگروں نے جو اینٹ جہاں رکھی وہ ہلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ جس جگہ ان بزرگوں نے دُعا کی

تھی خانخاناں نے ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرادی جس کا نام "مستجاب الدعوات" ہے۔ یہ مسجد پُل کے شمالی حصہ سے پورب نیچے اُتر کر ۴۰۔۵۰ قدم کے فاصلہ پر واقع ہے اور ایک مسجد عالی شان حضرت شاہ شیخو مجذوب کے لیے دونوں پُلوں کے درمیان تعمیر کرادی۔ اس پُل کا مادۂ تاریخ "صراط المستقیم" ۹۸۱ھ ہے۔ پُل کی صورت یہ ہے کہ در بہت چھوٹے ہیں اور ستون پُل کے در سے چوڑے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پانی کی کُل ٹکریں پُل سے آکے لگتی ہیں۔ ۱۸۷۱ء میں ایسی زبردست باڑھ آئی تھی کہ دریا کا دھارا پُل کے اُوپر جو کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں اُن کی چھتوں کے اُوپر سے بہتا تھا۔ شاہی زمانہ کی چار کوٹھریاں وسطِ پُل میں ہیں، بقیہ کوٹھریاں انگریزی زمانہ کی ہیں۔ اس طوفان کے سیلاب میں بھی کوٹھریوں اور پُل کی ایک کنکری بھی کہیں سے نہیں نکلی۔ انگریزی کوٹھریاں سب بہہ گئی تھیں تین مرتبہ تو میرے سامنے بھی پُل کے اُوپر سے دھارا بہا ہے۔ حضرت شاہ شیخو مجذوب اسی مسجد میں گدڑی پہنے بیٹھے رہتے تھے اور لرزہ سے ہر وقت کانپتے رہتے تھے۔ جب کوئی ملنے کے لیے آپ کے پاس آتا تو گدڑی اتار کر رکھ دیتے اور فرماتے کہ "اے جاڑے کی گدڑی میں چلا جا" گدڑی کانپتی رہتی اور خود ساکن بیٹھ کر باتیں کرتے۔ جب وہ شخص چلا جاتا تو گدڑی پہن لیتے اور پھر کانپنے لگتے۔ اُن کا مزار دروازۂ مسجد سے متصل زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت کا کلام معائبِ سخن سے بالکل پاک ہے۔ میرا بھی ارادہ تھا کہ حضرت کے اصول وقواعد جو شاعری میں تھے اُسے شرح وبسط کے ساتھ لکھوں مگر وقت کی تنگی مجبور کر رہی ہے۔ دو چار باتیں مختصراً لکھتا ہوں۔

حضرت کے یہاں "اور" بروزنِ "غور" لکھنا لازمی ہے اور "یاں" بجائے یہاں اور "واں" بجائے وہاں کے بالکل ناجائز ہے۔ زمیں، مکاں، آسماں وغیرہ اعلانِ نون کے ساتھ استعمال فرماتے تھے۔ "پہ" بجائے پر کے نہیں لکھتے تھے۔ کسی لفظ میں الف کہیں نہیں دبتا۔ خلاصہ یہ کہ جو لفظ جس طرح پر بھی بولا جاتا ہے نظم میں بھی اُسی طرح آنا چاہئے۔ اگر یہ نہیں ہے تو ناظم کے کمال میں کلام ہے غرض قواعد اتنے سخت تھے کہ دوسرے کا چلنا مشکل ہے۔ حضرت کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

ظاہر میں تو ہیں مگر نہیں ہم ؎ دریائے رواں نہ ہوں کہیں ہم

اس میں "نازنیں" اور "مہ جبیں" کے قافیہ کو اپنی طرف نسبت کر کے اس طرح نظم فرمایا ہے کہ وجد آجاتا ہے ملاحظہ ہو ؎

عاشق سے تو رنگِ رُخ نہ سنبھلا ؎ اُن کو دعوے کہ نازنیں ہم

دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

اللہ رے نورِ سجدۂ شوق ؎ مہ رو تم ہو تو مہ جبیں ہم

آیۂ کریمہ ہے 'سِیمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ' غالبؔ کی غزلوں پر اکثر غزلیں کہی ہیں۔ حضرت نے اپنی چند نکالی ہوئی غزلیں مولوی عبدالصمد صاحب کو دے دی تھیں۔ مولوی صاحب خود دہلی گئے تھے تو غالبؔ سے ملے اور وہ غزلیں سنائیں۔ غالبؔ دم بخود سنتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ اللہ! ایسے بکنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔ حضرت نے بارہا یہ فرمایا تھا کہ غالبؔ ہوتے تو سننے اور سنانے کا لطف ملتا مگر افسوس کہ حضرت کے کلام کا مجموعہ جو میرؔ کے چھ دیوان سے بھی زائد تھا سیوان ضلع سارن میں تلف ہوگیا۔ حضرت کو وقفِ خانقاہ کے مقدمہ کے سلسلہ میں دو برس تک جون پور سے نکلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دیوان سیوان میں ایک پٹارہ کے اندر رکھا ہوا تھا، برسات میں اُس پر پانی ٹپکا اور دیمکوں نے اُسے ایسا چاٹا کہ دس پانچ غزلیں بھی مکمل نہ دستیاب ہوسکیں۔ یہ کلام جو شائع ہو رہا ہے زیادہ تر بعد کا ہے۔ دو چار غزلیں جو دوسروں سے مل سکیں وہ بھی درج کر دی گئیں۔ غالبؔ کی غزل پر ایک غزل کہی تھی جس میں سے صرف دو شعر ملے، غالبؔ کا مطلع ہے ؎

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے :: بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

حضرت کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

وائے محرومی یہاں شوقِ شہادت دل میں ہے :: جوشِ آبِ زندگانی خنجرِ قاتل میں ہے

شعر ہے ؎

پھر وہی دل کی طلب ہے اُن کو شرم آتی نہیں :: خاک کر ڈالا جلا کر دل کو اب کیا دل میں ہے[1]

غالبؔ کی ایک غزل اور ہے جس کا مطلع ہے ؎

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے :: ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حضرت کی غزل کے صرف چار پانچ شعر دستیاب ہوئے مطلع ملاحظہ ہو ؎

قطرہ وہی کہ رو کشِ دریا کہیں جسے :: یعنی وہ میں ہی کیوں نہ ہوں تجھ سا کہیں جسے

مومنؔ کا شعر ہے ؎

آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہ ہائے التفات :: گم ہونا دل کا وہ مِری نظروں سے پا گیا

حضرت نے اسی مضمون کو اس پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

پیمانۂ نگاہ سے آخر چھلک گیا :: سرجوشِ ذوقِ وصلِ تمنا کہیں جسے

حضرت کا ایک مطلع ہے جس پر کم علم مولویوں نے کفر اور شرک کا فتویٰ دینے سے

---

[1] اب کیا دل میں ہے کا ذو معنی جملہ حدِ تحسین سے خارج ہے۔

دریغ نہیں کیا۔ حضرت نے جب یہ غزل کہی تھی میں خدمت میں حاضر تھا مطلع یہ ہے ؎

وہی جو مستویِ عرش ہے خدا ہو کر ؛ اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفٰے ہو کر

جب یہ مطلع فرمایا تو میری طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ "میاں شاہدؔ! جہلاء اِس شعر پر اعتراض کریں گے مگر اُن کے اعتراض کا جواب مصرعۂ اُولیٰ میں موجود ہے۔ یعنی وہ اب بھی مستوی علی العرش ہے۔ افسوس کہ اگر معترضین حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی فصوص الحکم وغیرہ دیکھے ہوتے تو اس گستاخی کی جرأت نہ ہوتی۔ اگر مصرعۂ اُولیٰ میں "وہی جو مستویِ عرش تھا خدا ہو کر" ہوتا تو البتہ اُن کا اعتراض خدا کے مجسّم ہونے کا صحیح ہوتا، وہ تو اب بھی مستوی علی العرش ہے۔ مدینہ میں اُترنا باعتبار نزولِ صفات کے ہے جیسے آفتاب آئینہ میں اُترتا ہے الاٰنَ کَمَا کَانَ۔ حضرت کے ایک شعر پر ایک صاحب نے اعتراض کیا تھا۔ شعر یہ ہے ؎

توُرات جہاں جلوۂ کاشانۂ دل تھا ؛ آج اُس کو جو دیکھا تو وہ دیوانۂ دل تھا

معترض نے یہ کہا کہ "دیوانۂ دل" غلط ہے "ویرانۂ دل" ہونا چاہیئے مگر ایسی صورت میں ایک مصرعہ کی ردیف بیکار ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کی کہ یہ تمام غزل دل کے حقائق و معارف میں ہے مطلب یہ ہے کہ توُرات جس کے کاشانۂ دل میں جلوہ گر تھا وہ کون ایسا خوش نصیب ہے، اور تیری جلوہ گری کا سبب کیا ہے؟ مگر یہ حیرت یوں دفع ہوئی کہ میں نے اُس کو دل کی طلب میں دیوانہ پایا۔ یعنی جو دل کا طالبِ صادق ہوتا ہے تو مطلوبِ حقیقی خود بخود اُس کے دل میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ دل کے حقائق میں اکابرینِ سلف کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ حضرت کے ایک شعر میں جحیم کا لفظ مؤنث نظم ہوا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

نعیم کیسی جحیم کیسی کرشمے سارے یہ حسُن کے ہیں ؛ کسی کو لوُٹا ثواب ہو کر کسی کو مارا عذاب ہو کر

میرے دل میں یہ شعر کھٹکتا تھا۔ میں نے ایک روز موقع پا کر حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ لکھنؤ میں جحیم مذکر مستعمل ہے، حضرت نے فرمایا کہ ہاں صحیح ہے یہ لکھنؤ والوں کا اجتہاد ہے اور یہ ہمارا اجتہاد ہے۔ غالباً ہم سے مراد خاندانِ ناسخؔ ہے۔ میر علی اوسط رشکؔ نے جو زبانِ اُردو کے اصول اور قواعد کا رسالہ لکھا تھا اس میں میم کو مؤنث لکھا ہے اور اُن کے اصُول میں آخر کے حروف کو بھی اوزان کے ساتھ تانیث و تذکیر میں بہت دخل ہے۔ حضرت نے رشید آباد درگاہ کے لیے پختہ سڑک سے درگاہ تک ایک سڑک اور پُل بنوایا تھا۔ زائرین کو درگاہ تک برسات میں پانی ہل کر جانا پڑتا تھا۔ حضرت شمشادؔ رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کہہ کے حضرت کی خدمت میں سنائی۔ میں حاضرِ خدمت تھا۔ مادۂ تاریخ یہ ہے۔ "پُلے مطاعِ زیارتگہِ رشید آباد" حضرت نے سننے کے بعد برجستہ

فرمایا۔" مولوی صاحب ! پُلے کی "ی" کو نکال کے "مطائع" کے "ع" کو "ف" سے بدل دیجئے"۔ اب مصرعہ یوں ہوا" پُلِ مطافِ زیارتگہِ رشید آباد"۔ اہلِ بینش سمجھ سکتے ہیں کہ مصرعہ کہاں سے کہاں، پہنچ گیا۔ افسوس ہے حضرت کی اصلاحیں مجھے دستیاب نہ ہو سکیں مگر ہم جلیسوں سے یہی سُنا کہ اصلاحیں بے مثل ہوتی تھیں اور جس نے ایک مرتبہ اصلاح لے لی دوسرے کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا۔ حضرت کا شعر ہے۔

؎ عشق کیا کیا نسبتیں کرتا ہے پیدا حُسن سے ؞ زلف اگر شب رنگ تھی نالہ مرا شب گیر تھا

اس شعر پر ایک شخص نے یہ اعتراض کیا کہ شب گیر صبح کے معنی میں مستعمل ہے اس لیے شعر بے معنی سا ہو جاتا ہے وہاں میرے پاس کوئی لُغت موجود نہ تھا اس لیے میں نے اُن سے عرض کی کہ اس کا جواب میں مکان پہنچ کر روانہ کروں گا۔ غیاثؔ، برہانؔ، جہانگیری وغیرہ و دیگر لُغات کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ "شب گیر" بمعنی "روندۂ شب" بھی مستعمل ہے۔ میں نے جب لغات کا حوالہ لکھ کر اُن کے پاس بھیج دیا تو اُن کی تشفی ہوئی۔

حضرت کا کلام جملہ اصنافِ سخن میں طاق تھا مگر افسوس کہ میں نے بہت کوشش کی مگر دستیاب نہ ہو سکا۔ تاریخیں بھی بکثرت اور لاجواب تھیں مگر صرف چند مل سکیں۔ ایک مثنوی بھی دستیاب ہوئی ہے جو دربارِ رسالت میں سلام کے طور پر ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

سلامِ مُسلسل چو زلفِ پری ؞ نثارِ سرِ چشمۂ پیغمبری

یہ سلام حضرت ہی کا ہے مگر غالباً مولوی وکیل احمد مرحوم سکندرپوری کے نام سے شائع ہوا تھا۔ رباعیاں کافی تعداد میں ملیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ زبانِ اُردو میں ایسی رُباعیاں دیکھنے میں نہیں آئیں۔

حضرت کا خُلق

حضرت کا خُلق اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کا مجسم مظہر تھا۔ چاہے کوئی کیسا ہی مصیبت زدہ اور مغموم ہوتا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی صورتِ مبارک دیکھ کر کُل رنج و غم بھول جاتا۔ ہر ادنیٰ اور اعلیٰ پر ایسی شفقت تھی کہ ہر شخص کو یہی دعویٰ تھا کہ مجھی کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ حضرت کی خدمت میں رہ کر لڑکے بالے ماں باپ گھر بار سب بھُول جاتا تھا اور جو جتنا ہی زیادہ گنہ گار ہوتا تھا اُس پر اتنا ہی زیادہ رحمت کا جوش ہوتا تھا۔ کوئی حاضر باش ایسا نہ تھا جس کے ساتھ سیکڑوں کرامتوں کا ظہور نہ ہوا ہو مگر اخفار کا یہ عالم تھا کہ جو واقعہ جس کے ساتھ پیش آتا تھا دوسرے کو اُس کی خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ مجھ سے کئی بار فرمایا تھا کہ میرے پیر نے مجھ کو وصیت کی تھی کہ درویشی کو اس طرح چھپانا چاہیئے جیسے عورت کُرسف کو چھپاتی ہے۔ حضرت کی کرامت کا اگر کوئی اظہار کرتا تھا تو اُس کو نقصان ہوتا تھا۔ لوگوں کے دلوں کے خطروں کا جواب دوسروں سے گفتگو کے دوران میں بے تکلف دے دیتے تھے جس کو سوائے صاحبِ خطرہ کے دوسرا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ حضرت کی کرامتیں اگر لکھی جائیں تو ایک ضخیم کتاب میں بھی نہ سمائیں گی۔ حضرت کی خدمت سے میں نے کسی صاحبِ غرض کو محروم جاتے

نہیں دیکھا بشرطیکہ جو حضرت کی زبان سے نکلا ہو اُس پر اُس نے عمل کیا ہو، جو کوئی اپنی غرض لے کر آتا حضرت کبھی کوئی دعا یا اسم بتا دیتے یا کسی بزرگ کے مزار پر حاضری کو فرماتے یا کوئی تعویذ وغیرہ دلوا دیتے۔ بعض مرتبہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کسی نے اپنی حاجت پیش کی اور حضرت نے انتہائی بے توجہی ظاہر کی اور اُدھر اُس کا کام ہو گیا۔ میں ۱۹۰۹ء میں جب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے خیالات کچھ وہابیت اور نیچریت لئے ہوئے تھے، جو خیال دل میں آتا تھا دوسروں پر رکھ کر اس کا جواب فوراً دے دیتے تھے، جب تک میرے عقائد بالکل درست نہ ہو لئے اُس وقت تک میرے ہر خطرے کا جواب فوراً ملتا رہا۔ اخیر میں اکثر یہ خطرات آئے کہ حضرت پر خطرات مکشوف ہوتے ہیں جب جواب ملتا ہے۔ یا حضرت کی تقریر ہی اتنی جامع ہوتی ہے کہ سب کے خیالات کے جواب ہو جاتے ہیں۔ اگر میں سامنے بیٹھا رہا تو آنکھ ملا کے جواب ملا۔ اگر پُشت کی طرف بیٹھا رہا تو میری طرف منہ پھیر کر فرمایا کہ تمہارا جواب ہے اور پھر دوسروں سے باتیں کرنے لگے۔ جملہ پیرانِ رشیدی اور حضرت کا معمول تھا کہ بغیر بلائے کسی مرید کے گھر نہیں جاتے تھے اور بلانا بھی جب بہت اصرار سے ہو۔ میں ۱۹۱۳ء میں بعارضۂ دردِ جگر مبتلا ہوا اور درد اتنا شدید ہوتا تھا کہ میرے کراہنے کی آواز سڑک تک جاتی تھی حضرت نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اپنے جدِ امجد حضرت سید شاہ قیام الدین قدس سرہٗ کو حضرت دیوان جی سمجھو اور جو تمہاری حاجت ہو اُن سے عرض کیا کرو۔ حضرت شاہ قیام الدین صاحب قدس سرہٗ کا مزارِ مبارک ہم لوگوں کے مکان کے اندر صحنِ مسجد میں واقع ہے۔ جب درد کی شدّت ہوتی تھی تو کسی کو مزار پر بھیجتا تھا اور جب مزار کی خاک لا کے لگا دی جاتی تھی تو درد ساکن ہو جاتا تھا۔ مگر جب تک کوئی آدمی وضو کر کے مزار پر جائے اور خاک لا کر لگائے میری حالت غیر ہو جاتی تھی۔ خاک لگانے کے ساتھ ہی درد ساکن ہو جاتا تھا مگر پھر دورہ پڑتا تھا۔ حضرت اُس زمانے میں غازی پور تھے، جب مجھے کئی دن اسی حالت میں گزر گئے تو میں نے ایک دن لیٹے لیٹے حضرت کی خدمت میں اپنی حالت کی اطلاع لکھی۔ خط دو بجے دن کو ڈاک میں ڈالا گیا۔ حضرت نے اُس دن دو بجے دن کو اپنے خادم حافظ نبی بخش مرحوم کو حکم دیا کہ "نبی بخش! میرا اسباب باندھ۔ میں آج ہی گورکھپور چلوں گا اور سبحان اللہ کو تار دے دے کہ میں صبح کو پہنچوں گا۔" سب لوگ متحیّر تھے کہ حضرت کا ارادہ گورکھپور کا تھا بھی نہیں اور گورکھپور سے کسی نے بُلایا بھی نہیں۔ اس خلافِ معمول قصد میں کیا رمز ہے۔ مولوی سبحان اللہ صاحب نے شام کو میرے پاس اطلاع بھیجی کہ حضرت صاحب صبح تشریف لا رہے ہیں۔ اس خبر سے جس قدر مجھے خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ میں روزانہ پالکی میں سوار ہو کر مولوی صاحب کے مکان پر حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور جہاں کہیں گوشہ میں جگہ مل جاتی بیٹھ رہتا تھا۔ نہ حضرت میرا حال پوچھتے تھے اور نہ مجھے کہنے کی حاجت تھی۔

چلتے وقت حضرت کی جوتیوں کی خاک چاٹ کر چلا آتا تھا۔ میری علالت کے بارہویں دن ڈاکٹر جگیسر رائے نے جواب دے دیا کہ ان کا مرض لاعلاج ہے۔ جگر اتنا بڑھ گیا ہے کہ اگر پیٹ کا آپریشن کر کے جگر کا بڑھا ہوا حصہ کاٹ کر نکال دیا جائے تو شاید بچ جائیں۔ مجھے اس واقعہ کی کوئی خبر نہیں تھی مگر والدہ کی حالت روتے روتے غیر ہوگئی۔ اُس دن جو میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت استنجے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور اتفاق سے تخلیہ بھی تھا۔ حضرت جب استنجے سے فارغ ہو کر واپس تشریف لائے تو مجھ سے پوچھا "میاں شاہد! تمہارا کیا حال ہے؟" میں نے امتثالِ امر کے خیال سے اپنا حال عرض کیا۔ مجھے ایک پلنگ پر لٹایا اور خود ایک کرسی پر جلوہ فرما ہوئے اور فرمایا دیکھوں کہاں درد ہے؟ میرے جگر پر انگشتِ شہادت سے دبا کر فرمایا کہ کہیں ورم وغیرہ تو نہیں ہے۔ انگشتِ مبارک میرے جگر پر پڑنے کے ساتھ ہی ورم اور درد سب غائب ہو گئے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ تھا تو بہت کچھ مگر اب واقعی کچھ نہیں ہے۔ میں بالکل اچھا ہو کر مکان واپس آیا۔ شام کو جب ڈاکٹر صاحب میرے پاس آئے تو سخت متحیّر ہوئے، بہت دیر تک دیکھتے رہے نہ ورم تھا نہ درد، جس مریض کو صبح کو جواب دے کر جاتے ہیں وہ اُسے شام کو بالکل اچھا پاتے ہیں۔ صحت کی خوشی کے نشہ میں میرے منہ سے نکل گیا کہ ڈاکٹر صاحب! کیا دیکھتے ہیں میرے پیر تشریف لائے ہیں، انہوں نے اچھا کر دیا۔ ڈاکٹر اس قدر معتقد ہوئے کہ جب تک حضرت تشریف فرما رہے برابر حاضرِ خدمت ہوتے تھے۔ مجھ کو یہ معلوم تھا کہ پیروں کی حیات میں اُن کی کرامتوں کا اظہار عتاب میں ڈالتا ہے مگر خوشی کا نشہ ایسا تھا کہ اور بھی دو ایک آدمیوں کے سامنے اس واقعہ کا اظہار ہو گیا۔ تین چار روز کے بعد ایک دن دوپہر میں پھر خفیف درد جگر میں محسوس ہوا۔ اب کے میں بہت پریشان ہوا اور سمجھا کہ پہلے تو مرض تھا مگر اب اپنی کم ظرفی کی وجہ سے پیروں کے عتاب میں مبتلا ہوں۔ اِس درد کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ دو بجے کے قریب میں نے اپنے چھوٹے سالے میاں حسین احمد کو حضرت کی خدمت میں بھیجا اور یہ کہا کہ جا کر عرض کرو کہ شاہدؔ نے عرض کی ہے کہ میں اپنے خطرے سے توبہ کرتا ہوں، یہاں میں درد سے بے چین ہوں مگر کسی پر اظہار نہیں ہے۔ حضرت ظہر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ میاں حسین احمد نے جا کر یہ پیغام عرض کیا۔ حضرت مسکرا دیئے۔ یہاں میرا درد غائب ہو گیا پھر میں نے اس واقعہ کا اظہار حضرت کی حیات تک کسی سے نہیں کیا، اس کے چند دنوں کے بعد میں بخار میں مبتلا ہوا اور علالت نے پانچ مہینے تک طول کھینچا۔ علالت کے ساتھ کھانسی بھی تھی۔ اکثر طبیبوں کی رائے یہ ہوئی کہ دق ہے۔ جب میری صحت سے سب لوگ مایوس ہو گئے اور علالت سے حالت اس درجہ پر پہنچ گئی کہ گھڑی ساعت کا مہمان رہ گیا تھا۔ صبح سے شام اور شام سے صبح کی اُمید نہیں رہی تھی تو میری بیوی نے حضرت صاحب کو یاد کر کے عرض کی کہ وصی کو جو اس وقت تک میرا ایک ہی لڑکا تھا۔

(اور نیز گھر بھر میں بھی ایک ہی لڑکا تھا) اُٹھا لیجئے اور اُن کو اچھا کر دیجئے۔ اس کے بعد وصی کو نمونیہ ہوا اور اُس کی علالت بڑھتی گئی۔ جس دن وہ مر گیا میری حرارت زائل ہو گئی۔ اسی اثناء میں حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی کا عرس آیا اور میں نے رس گُلّا منگوا کے فاتحہ دلوائی اور جوشِ عقیدت میں دو رس گُلّے کھا گیا۔ حالانکہ اُس وقت میری خوراک ایک پُھلکے کا چھلکا بھی بدقت تمام تھی۔ حکیم صاحب کو جو میرے معالج تھے دو دن کے بعد جو رس گُلّا کھانے کی خبر ہوئی تو آکے بہت برہم ہوئے اور اُن کے منہ سے یہ جملہ نکلا کہ اگر مدینہ منورہ کی کھجور بھی ہوتی تو میں بحیثیت طبیب ہونے کے کھانے کی اجازت نہ دیتا۔ حکیم صاحب جو اپنے کو محدث بھی کہتے تھے میں نے اُن سے عرض کی کہ حکیم صاحب حدیث شریف میں وارد ہے کہ مدینہ منورہ کی کھجور اور مدینہ منورہ کا غبار ہر مرض کے لیے شفا ہے سوائے موت کے۔ اب میں آپ کا علاج نہیں کر سکتا' مجھ کو مر جانا قبول ہے۔ اِس کے بعد میری والدہ نے سید حسین احمد کو حضرت کی خدمت میں منڈواڈیہہ بھیجا کہ وصی سخت بیمار ہو گیا ہے۔ میاں حسین احمد جونہی حضرت کے سامنے پہنچے اور کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ حضرت نے بڑے زور سے ڈانٹ کے فرمایا کہ دونوں نہیں اچھے ہو سکتے' یا یہ اچھے ہوں گے یا وہ' اور اپنے خادم سے فرمایا کہ شاہد کے لیے مخدوم صاحب کے عرس کی مٹھائی بھیج دے اور میاں حسین احمد سے فرمایا کہ یہی مٹھائی اُن کو صبح شام کھلائی جائے۔ اسی کو کھا کے وہ اچھے ہوں گے کسی علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اسی کو کھا کے میں اچھا ہوا، میں بہت محرور المزاج تھا اور سال میں چار پانچ مہینے مجھے بخار میں گزرا کرتے تھے۔ اور جب بخار آتا تھا تو دق کا اشتباہ واقع ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضر تھا، مہینے ڈیڑھ مہینے سے اندر خفیف حرارت رہا کرتی تھی۔ میں اپنی طبیعت سے اطفائے حرارت کے لیے ایک نسخہ پیا کرتا تھا، حرارت زائل نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن خدمتِ اقدس میں بیٹھا ہوا تھا میرے دل میں خیال آیا کہ یہ حرارت دق کی تو نہیں ہے۔ حضرت نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا تم کو حرارت رہتی ہے؟ میں نے عرض کی کہ ہاں۔ فرمایا کہ میں نبض تو دیکھوں۔ میں نے ہاتھ بڑھایا نبض دیکھنے کے بعد فرمایا وہ بات نہیں ہے (یعنی دِق نہیں ہے) مجھ سے پوچھا کہ کیا پیتے ہو؟ میں نے دواؤں کے اجزاء عرض کئے۔ فرمایا کہ اس میں ۶ ماشہ تخمِ پالک بڑھا دو۔ اس کے بعد تخمِ پالک کے اضافہ کے دو تین دن کے بعد میری حرارت دُور ہو گئی اور حضرت کے اس فرمانے کے بعد سے کہ وہ بات نہیں ہے اس قسم کی حرارت نہیں آئی جس سے دق کا احتمال ہوتا۔

حضرت صاحب ایک مرتبہ متلی کے عارضہ میں مبتلا ہوئے تھے اور پانچ مہینے تک نہ کوئی دوا اور نہ کوئی غذا ہضم ہوئی۔ حضرت صاحب دوا پینی نہیں چاہتے تھے' اعزاء عرض کرتے تھے کہ پی لیجئے۔ مگر آپ انکار فرماتے تھے۔ جب لوگ اصرار کرتے تھے تو پی لیتے تھے مگر فوراً ہی قے ہو جاتی تھی جس سے

بہت سخت تکلیف ہوتی تھی۔ میں لوگوں کو کتنا ہی سمجھاتا تھا کہ حضرت کی طبیعت پر چھوڑ دو لیکن لوگ مانتے نہیں تھے۔اس علالت کے دوران میں حضرت کے مُنہ سے یہ مصرعہ اکثر سننے میں آتا تھا ؎

اے خداوندِ جہاں بات ہماری رکھنا

پانچ مہینے کے فاقہ کے بعد حضرت نے خادم کو حکم دیا کہ "بھتّا لاؤ"۔ خادم نے بھتّا پیش کیا۔ نوش فرمانے کے بعد ہی نہ متلی رہی نہ کوئی مرض رہا۔کسی ڈاکٹر یا حکیم کی سمجھ میں مرض نہیں آیا۔ اطباء نے شرح اسباب و قانون وغیرہ چھان ڈالے، کسی جہت کی علامتیں حضرت کی حالت سے مطابقت نہیں کرتی تھیں۔ جونپور میں عبدالرحیم خاں مرحوم کا مکان حضرت خواجہ محمد عیسیٰ تاج قدس سرہٗ کے روضہ کے متصل تھا۔خاں صاحب اکثر بے فصل کے بھتّے تلاش کر کے لاتے تھے اور حضرت کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ حضرت اُن سے بہت خوش رہتے تھے۔ خاں صاحب راجہ ابو جعفر مرحوم رئیس پیر پور کے وہاں ملازم تھے۔خاں صاحب ملازمت ترک کر کے گھر چلے آئے تھے جو راجہ صاحب کے خلافِ مزاج ہوا۔ راجہ صاحب نے اُن پر دو مقدمے خیانتِ مجرمانہ کے جونپور میں چلائے۔ حضرت صاحب نے جو ترکیبیں خاں صاحب کو بتادی تھیں وہ اُن پر عامل تھے۔ایک انگریز جوائنٹ مجسٹریٹ کے اجلاس میں اُن کا مقدمہ تھا۔ جنٹ صاحب خاں صاحب کو دیکھنے کے ساتھ ہی آگ بگولا ہو جاتے تھے۔ مقدمہ کی کارروائی ختم ہوگئی اور بحث بھی ہوگئی۔ خاں صاحب کے وکیلوں نے جواب دے دیا کہ مقدمہ ثابت ہو گیا ہے، آپ کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ سینچر کے دن فیصلہ سنانے کی تاریخ مقرر ہوئی، عدالت کا رنگ دیکھ کر وکیلوں کا گمان تھا کہ فیصلہ سینچر کی شام کو سنایا جائے گا تاکہ دوسرے دن اتوار ہونے کی وجہ سے ضمانت بھی نہ ہو سکے۔ جمعرات کے دن دس بجے کے قریب خاں صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اتفاق سے صرف میں حضرت کی خدمت میں حاضر تھا۔ خاں صاحب نے کُل حال عرض کیا۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ تاریخ کے دن پہلے حضرت خواجہ "محمد عیسیٰ تاج" قدس سرہٗ کے مزار پر حاضری دینا اور پھر رشید آباد جانا اور پھر کچہری جاتے وقت حضرت قطب الدین بینا دل قلندر قدس سرہٗ کے مزار پر ہو کر جب کچہری جانا۔ اس کے بعد کچھ توقف کر کے فرمایا کہ "خاں صاحب! آپ ہر سال میری دعوت کیا کرتے تھے' اس سال میری دعوت نہیں کی (خاں صاحب اپنے کھیت کی ہری مٹر کی "برہیں" کی روٹیاں پکا کے ہر سال حضرت کو کھلایا کرتے تھے۔ ان اطراف میں "برہیں" اُس روٹی کو کہتے ہیں جس کے بیچ میں ہری مٹر یا ہرے چنے کی دال پیس کے دی جاتی ہے۔ یہ روٹیاں گھی میں تلی نہیں جاتیں بلکہ توے پر پکانے کے بعد گھی اوپر سے لگا دیا جاتا ہے) ـــــ خاں صاحب نے عرض کی جب حکم ہو پیش کروں۔ حضرت نے فرمایا کہ چوتھے دن لاؤ (یعنی اتوار کو) خاں صاحب نے عرض کی کہ حضور! میں پرسوں خدا جانے کہاں رہوں کل ہی کیوں نہ لاؤں؟ حضرت

نے فرمایا نہیں چوتھے دن۔ مجھے اس بشارت سے بڑی مسرت ہوئی۔ خان صاحب حسب ہدایت عمل کرکے کچہری تشریف لے گئے۔ جنٹ صاحب نے اوّل ہی وقت فیصلہ سنانے کے لیے طلب کیا۔ تجویز گھر سے لکھ کر لائے تھے۔ خان صاحب کی صورت دیکھنے کے ساتھ ہی مبہوت ہو گئے۔ تجویز ہاتھ میں ہے اور منہ سے آواز نہیں نکلتی۔ بہت دیر تک خان صاحب کا منہ تکتے رہے۔ اس کے بعد آخر کے دو ورق پھاڑ کے ردّی کی ٹوکری میں پھینکے اور اُن کی بریّت کی تجویز لکھ کے یہ فیصلہ سُنایا کہ دونوں مقدمے میں خان صاحب دو دو سو روپے معاوضہ دیں (جرمانہ نہیں) راجہ صاحب کے مختارِ عام سے کہا کہ تم ایک درخواست دو کہ اب دوسرا مقدمہ ان پر نہیں چلایا جائے گا۔ اور درخواست لے کر شاملِ مسل کر دی۔ پیشکار صاحب نے پھاڑے ہوئے ورق پڑھ کے بتایا کہ دو برس کی قید سخت کی سزا لکھ کے جنٹ صاحب لائے تھے، خان صاحب نے کسی سے قرض لے کے یہ روپے ادا کر دیئے۔ قرض خواہ کا تقاضا رہا کرتا تھا لیکن خان صاحب ناداری کی وجہ سے ادا نہیں کر پاتے تھے۔ ایک روز قرض خواہ نے ایسی سخت کلامی کی جس سے خان صاحب کو بڑی تکلیف ہوئی اس روز شب میں خان صاحب میاں بیوی خواجہ صاحب کے روضہ میں حاضر ہوئے۔ خواجہ صاحب کے مزار پر قدم پکڑ کے خان صاحب نے عرض کی یا حضرت! سات سو روپے مجھ پر قرض ہیں، یہ روپے مل جاتے تو میں قرض سے سُبک دوش ہو جاتا۔ بیوی نے کہا نہیں آپ بھُول رہے ہیں، قرض پانچ ہی سو ہے۔ میاں بیوی رو دھو کے گھر آئے۔ خان صاحب باہر سوئے۔ بیوی اندر سوئیں۔ بیوی نے یہ خواب دیکھا کہ کسی نے میرے تکیہ کے نیچے کوئی چیز رکھی اور یہ کہا کہ خواجہ صاحب نے بھیجا ہے۔ صبح کو آنکھ کھلی تو تکیہ کے نیچے تینتیس گنّی اور پانچ روپے موجود تھے۔ خان صاحب خوشی کے مارے پھُولے نہ سمائے اور حضرت کی خدمت میں لے کر دوڑے ہوئے آئے کہ یہ واقعہ رات ہوا ہے۔ حضرت صاحب مُسکرائے اور فرمایا کہ خواجہ صاحب نے تمہارا قرض ادا کر دیا۔ جاؤ قرض خواہ کو دے آؤ۔

بابو محمد اسمٰعیل علی خاں رئیس علی گنج سیوان ضلع سارن ایک سنگین مقدمہ میں ماخوذ تھے جب مقدمہ ثبوت کو پہنچ گیا اور روداد مقدمہ سے مایوسی ہوئی تو فیصلہ کی تاریخ سے ایک دن قبل حضرت کو اطلاع دی گئی۔ حضرت عین تاریخ کے دن سیوان پہنچے اور بابو صاحب مرحوم کی پیشانی پر کچھ لکھ کر کچہری روانہ کیا اور حکم دیا کہ کچہری سے لَوٹ کے میرے پاس ہو کے تب مکان جانا۔ میں انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں۔ جب تک بابو صاحب بَری ہو کے کچہری سے لَوٹ نہیں لئے حضرت صاحب کرسی پر بیٹھے رہے۔ ایس ڈی او صاحب نے بعد کو بابو صاحب سے مل کر فرمایا کہ میں نے چھ سات مرتبہ آپ کی سزا کی تجویز لکھی مگر جب تجویز لکھتا تھا تو آپ کی بریّت ہی قلم سے نکلتی تھی۔ ہر مرتبہ میں اپنی دانست میں سزا کرتا تھا مگر قلم سے آپ کی رہائی ہی نکلتی تھی۔ بابو صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد بابو عبدالمجید خاں خلفِ اکبر اُن کے جانشیں ہوئے تھے۔

بہن برہ شریف کے عرس میں بابو عبدالمجید خاں مرحوم کی والدہ صاحبہ وغیرہ تشریف لے گئی تھیں۔ رات کے وقت حضرت کی خدمت میں ان لوگوں کو باریابی نصیب ہوئی۔ حضرت نے فرمایا کہ عبدالمجید خاں کے اوپر ہے زبر دست سحر ہوا ہے اور ایک تعویذ عطا فرمایا اور حکم دیا کہ ابھی آدمی جائے اور ان کے گلے میں پہنادے۔ عورتیں پریشانی سے رونے لگیں۔ ایک آدمی اسی وقت تعویذ لے کر سیوان روانہ ہوا۔ تین بجے شب میں آدمی سیوان پہنچا تو بابو صاحب کو سینہ کے درد میں تڑپتا ہوا پایا۔ یہ درد اسی وقت شروع ہوا تھا جس وقت حضرت نے سحر کی خبر دی تھی۔ تعویذ پہنانے کے ساتھ ہی درد ساکن ہو گیا اور وہ اچھے ہو گئے۔

شاہ بدر عالم صاحب رئیس غازی پور کو حضرت سے بہت عقیدت تھی اور غلامی میں بھی داخل تھے۔ شاہ صاحب مرحوم کی انگریزی کی قابلیت بی اے اور ایم اے والوں سے بہتر تھی مگر شاہ صاحب کے پاس انٹرنس کی ڈگری بھی نہ تھی۔ جب شاہ صاحب نے اپنے املاک فروخت کر ڈالے تو حضرت نے حکم دیا کہ الٰہ آباد جا کے ہائی کورٹ کی وکالت کے امتحان کی درخواست دو۔ شاہ صاحب نے درخواست دی اور وہ منظور ہو گئی۔ سب لوگ متعجب تھے کہ بغیر کسی تعلیمی سند کے ہائی کورٹ کی وکالت کے امتحان کی اجازت کا مل جانا ہندوستان میں پہلا واقعہ ہے۔ میں حضرت کی خدمت میں ایک روز بیٹھا تھا اور کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ حضرت نے مجھ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "میاں شاہد! تم نے دیکھا شاہ بدر عالم صاحب کو ہائی کورٹ کی وکالت کے امتحان کی اجازت مل گئی۔ میں نے کہا جی حضور فرمایا کہ جو یہ اَن ہونی بات کرا سکتا ہے کیا وہ امتحان میں پاس نہیں کرا سکتا؟ میں نے عرض کیا کہ حضور! وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ حضرت کی کافی توجہ شاہ صاحب کے حال پر تھی اور مجھے یقین تھا کہ شاہ صاحب امتحان میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر شاہ صاحب کی بدقسمتی کہ جب الٰہ آباد امتحان میں جانے کے لیے شاہ صاحب حضرت سے رخصت ہونے کے لیے جونپور تشریف لائے حضرت پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پچھم طرف کھٹولے پر آ کے شاہ صاحب بیٹھے۔ رخصتی کے وقت حضرت نے شاہ صاحب سے مصافحہ کیا اور ہاتھ پکڑ کے دعائیں دیتے رہے کہ خدا تم کو کامیاب کرے خوش جاؤ اور خوش آؤ۔ شاہ صاحب کی شامت جو آئی تو شاہ صاحب نے کہا کہ حضرت یہ فرما دیجئے کہ تم پاس ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور پیروں کے کرم پر بھروسہ رکھو اللہ تعالیٰ تم کو کامیاب کرے۔ پھر شاہ صاحب نے یہی عرض کی پھر حضرت نے یہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تمہیں ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔ اللہ کا نام لے کے جاؤ۔ پھر شاہ صاحب نے عرض کیا کہ آپ جب تک یہ نہ فرما دیں گے کہ تم پاس ہو گئے میں نہ جاؤں گا۔ یہ سننے کے ساتھ ہی جلال سے حضرت کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو گئیں اور ڈاڑھی کے بال کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ تم مجھ سے وہ بات کہلوانا چاہتے ہو جو میرے پیروں کے منہ سے کبھی نہیں نکلی۔ یہ کہہ کے حضرت خاموش

ہو گئے۔ شاہ صاحب بھی ہیبت سے کانپنے لگے اور چپکے سے رخصت ہو کے الٰہ آباد روانہ ہو گئے۔ میں نے اُسی وقت یہ سمجھ لیا کہ اب شاہ صاحب کی کامیابی دشوار ہے۔ ہائی کورٹ سے تین سال تک امتحان دینے کی اجازت ملی تھی۔ اس سال شاہ صاحب امتحان میں ناکامیاب ہوتے۔ دوسرے سال جب پھر شاہ صاحب رخصت ہونے کے لیے تشریف لائے تو حضرت نے فرمایا کہ جناب شاہ عبدالسبحان صاحب سے مل کے جب الٰہ آباد جانا (شاہ عبدالسبحان صاحب موضع پہتیا ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے اور سلسلۂ نقشبندیہ میں اپنے پیر شاہ عبدالقادر قدس سرہٗ کے صاحبِ سجادہ اور حضرت کے اجل خلفاء میں سے تھے) شاہ بدر عالم صاحب نے کہا کہ میں سوائے اپنے پیروں کے کسی کے پاس نہ جاؤں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم میرے بھیجے ہوئے جاتے ہو اُن کے پاس جانا میرے ہی پاس جانا ہے۔ شاہ صاحب نے عرض کی کہ میں سوائے اپنے پیروں کے کسی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں حکم دیتا ہوں کہ اُن کے پاس جاؤ۔ شاہ صاحب نے عرض کی کہ میں اس حکم کو نہیں مانتا۔ حضرت خاموش ہو گئے اور شاہ صاحب پھر ناکام ہوئے۔ تیسرے سال پھر حضرت نے یہی فرمایا کہ شاہ عبدالسبحان صاحب سے مل کے جاؤ مگر شاہ صاحب نے نہیں مانا اور پھر ناکام ہوئے۔

حضرت کے مزاج میں جلال اُن کے پیر و مُرشد سے بھی زیادہ تھا۔ حضرت فرماتے تھے کہ میری حالت دیکھ کے میرے پیر و مُرشد نے مجھے حلیمؔ پکارنا شروع کیا اور حلیمؔ کہتے کہتے مجھے حلیم کر دیا۔

حضرت کے مزاج میں طہارت کے متعلق بہت غلوٗ تھا بمصداق اِس آیۂ کریمہ کے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ ط یعنی تحقیق کہ اللہ تعالیٰ طہارت میں مبالغہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ مگر یہ مبالغہ حدودِ شرعی سے باہر نہیں تھا۔ غازی پور میں حضرت کے بہت بڑے دوست مولوی سید ولایت حسین صاحب مجتہد مغفور کا واقعہ بیان کر کے یہ فرماتے تھے کہ دیکھو ایمان داری اس کا نام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مولوی صاحب موصوف کا ارادہ زیارت کربلائے معلّٰی و حج وغیرہ کا ہوا تو مولوی صاحب کو خیال آیا کہ میرے دادا کے زمانہ میں ایک موضع رہن بالقبض لیا گیا تھا اب تک میں اُس کا سود کھا رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے جب سے وہ موضع رہن لیا گیا تھا اُس کی کُل آمدنی کا حساب کیا اور جو رقم زرِ پیشگی دی گئی تھی اُس میں سے باقی نکالا اور رہن کرنے والے کے ایک ایک وارثِ شرعی کو تلاش کر کے حسبِ تخریج حصۂ شرعی وہ موضع مفت واپس کیا اور جو رقم زائد زرِ پیشگی سے وصول ہوئی تھی وہ سب واپس کر کے جب زیارت کو تشریف لے گئے۔ اللہ اللہ! کیسے لوگ تھے اب ایسی ہستیاں خواب و خیال ہو گئیں۔

وصال سے پانچ سات برس پہلے حضرت پر نسبتِ چشت کا غلبہ بہت زیادہ ہو گیا تھا

اور خواجہ غریب نواز کی بارگاہ میں مندرجہ تین شعر شاہ عبدالسبحان صاحب کے علاوہ اور بھی دو ایک آدمیوں کی معرفت کہلوایا تھا۔ شعر یہ ہیں ؎

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گِلہ دل کا ٭ بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

میں اور مئے ناب میرا منہ یہ کہاں ہے ٭ تلچھٹ بھی اگر دے کرمِ پیرِ مُغاں ہے

یک نظر فرما کہ مستغنی شوم زابنائے جنس ٭ سگ کہ شد منظورِ نجم الدین سگاں را سرور است

اس شعر کی تلمیح یہ ہے کہ حضرت میر سید نجم الدین کبریٰ رضی اللہ عنہٗ کی مجلس میں جو مولانا رومؒ کے دادا پیر تھے، یہ ذکر چلا کہ حدیث میں ہے کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل یعنی میری اُمت کے علماء مثل بنی اسرائیل کے انبیاء کے ہیں۔ اصحابِ کہف کی صحبت میں کتّا جس کا نام ''قطمیر'' تھا، ولی ہو گیا تھا۔ اولیائے اُمتِ محمدیؐ میں بھی ایسے لوگ ہیں؟ حضرت میر سید نجم الدین کبریٰؒ نے فرمایا کہ ''ہیں کیوں نہیں'' اتفاق سے ایک کتّا سامنے آگیا۔ آپ نے اُس پر ایک توجہ کی نظر ڈالی وہ کتّا ولی ہو گیا۔ اور اس کتّے کی قوت کا یہ عالم تھا کہ اُس کے اردگرد صبح کو ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ صبح کو پہلی نگاہ جس شخص پر اُس کتّے کی پڑتی تھی وہ ایک نظر میں ولی کامل ہو جاتا تھا۔ اُس کتّے کا مزار نیشاپور میں ہے۔ حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر کچھوچھوی رضی اللہ عنہٗ نے اپنی ایک مجلس میں اس واقعہ کا ذکر کیا۔ کسی نے عرض کی کہ حضرت اب بھی اس قوت کے اولیاء اللہ ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہوتے کیوں نہیں۔ حسنِ اتفاق سے ایک بلّی سامنے آگئی۔ آپ نے اُس پر توجہ ڈالی اور وہ ولیہ ہو گئی۔ بی بی بِلائی کی کرامت یہ تھی کہ روزانہ مخدوم صاحب کے سامنے آکے جتنے مہمان آنے والے ہوتے تھے اتنی ہی بولیاں بولتی تھیں۔ حضرت مخدوم صاحب فرماتے کہ اتنے مہمان آنے والے ہیں اتنے آدمیوں کا کھانا پکاؤ۔ روزانہ کا یہی معمول تھا۔ اتفاق سے ایک روز ایک مہمان زیادہ آگیا، بی بی بِلائی ایک بولی کم بولی تھیں۔ آپ نے بی بی بِلائی کو بُلا کر کہا کہ کیوں بی بی بِلائی آج تم ایک مہمان کو کھا گئیں۔ بی بی بِلائی نے سر جھکا لیا اور کچھ نہ بولیں۔ صبح کو معلوم ہوا کہ وہ مہمان نہیں تھا بلکہ چور تھا مہمان بن کے آیا تھا رات کو چوری کر کے چلتا ہوا۔ بی بی بِلائی کا مزار کچھوچھہ شریف میں مخدوم صاحب کی درگاہ میں موجود ہے۔

اور لوگ تو یہ اشعار مزار پر جا کر پڑھ دیا کرتے تھے مگر شاہ عبدالسبحان قدس سرہٗ نے مراقبے میں حضرت خواجہ غریب نواز کی زیارت سے مشرف ہو کے عرض کیا تھا جس کا جواب حضرت خواجہ غریب نواز نے یہ فرمایا تھا کہ ''میں محمد عبدالعلیم کا ہوں اور محمد عبدالعلیم میرے ہیں۔'' اور ایک خط بھی عطا ہوا تھا جس کے مضمون کا انکشاف کسی پر نہیں ہوا۔ حضرت محبوبِ الٰہی رضی اللہ عنہٗ کے مزار پر مراقبے میں شاہ عبدالسبحان صاحب سے حضرت محبوبِ الٰہی رضی اللہ عنہٗ نے یہ الفاظ فرمائے کہ محمد عبدالعلیم کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ

میرے سلسلے کا رواج اُن اطراف میں تمہاری ذات سے قائم ہے اور یہاں سے بھی ایک خط عطا ہوا تھا یہ خط بھی صیغۂ راز میں رہ گیا۔ حضرت نے یہ دونوں خط اور اپنے پیر و مرشد کا ایک خط جن کی ایک نقل یعنی پیر و مرشد کے خط کی نقل میرے پاس موجود ہے جس کا ایک جملہ یہ ہے کہ تم بمقابلہ اس فقیر کے اس امرِ خطیر کے زیادہ سزاوار اور اہل ہو۔ حضرت دیوان جی قدس سرہٗ کے قرآن شریف (جس میں خانقاہ شریف کے کُل سجادگان تلاوت کرتے آئے تھے) کے شروع کے دو سادے ورقوں کے درمیان رکھ کے لئی سے چپکا کے بند کر دیئے تھے/ حضرت کے سالِ وصال یا سالِ وصال سے ایک سال قبل جس بستے میں یہ کلامِ پاک رکھا ہوا تھا۔ اونڑیہار جنکشن کے اسٹیشن پر جونپور کی گاڑی بدلنے میں غازی پور سے بنارس جانے والی گاڑی میں چھوٹ گیا۔ بعد کو ہر طرف تار دیئے گئے مگر کوئی پتہ نہیں ملا۔ ہم لوگوں کی نگاہوں پر غفلت کا پردہ ایسا پڑا ہوا تھا کہ جب بھی نہ سمجھے کہ یہ سالِ وصال ہے۔ اسی سلسلۂ چشت کے غلبہ کے دوران میں ایک شب قاضی عبدالبصیر معصوم پوری مرحوم اور غلام رسول عرف تو بہ شاہ سیوانی مرحوم رات بھر اپنی کیفیت میں مست صبح تک غزلیں پڑھتے رہ گئے۔ میں بھی دو بجے رات تک حاضرِ خدمت رہا حضرت سو رہے تھے اور چہرے کی عجیب روشنی اور حالت تھی جو کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ میں دو بجے رات کو اُٹھ کے خانقاہ سے متصل جو خلوت خانہ ہے اُس میں چلا آیا تھا۔ چار بجے رات کے قریب ان دونوں آدمیوں کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بچشم ظاہر ہوئی۔ ان لوگوں نے یہ دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمان سے اترے اور حضرت کے منہ میں مُجسّم سما گئے۔ مجھ سے جب صبح کو ان دونوں آدمیوں نے یہ واقعہ بیان کیا تو مجھے اپنی بدقسمتی پر جس قدر افسوس ہوا وہ بیان سے باہر ہے کہ اگر میں دو گھنٹے اور خدمتِ اقدس میں رہ گیا ہوتا تو شرفِ زیارت سے محروم نہ ہوتا۔ حضرت کو وصال سے پیشتر بیشتر اوقات استغراق کا غلبہ رہتا تھا۔ غلبۂ استغراق میں یہ حالت رہتی تھی کہ نواسی صاحبہ تو کیا اپنے آپ کو بھی نہ پہچانتے تھے۔ اس حالت میں لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ کی مظہریت کی شان نظر آتی تھی اور جب پھر عالم ناسوت کی طرف متوجہ ہوتے تھے تو تمام باتیں حسبِ معمول کرتے تھے۔ وصال سے تین سال قبل سے غذا ترک کر دی تھی تین تین، چار چار، پانچ پانچ دن پر دو ایک تولہ کھا لیا کرتے تھے۔ ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بھوک نہیں لگتی۔ خانقاہِ رشیدی کا معمول یہ ہے کہ جب تک تمام مہمان کھانا نہ کھالیں صاحبِ سجادہ کھانا نہیں کھاتے۔ حضرت غازی پور میں تشریف رکھتے تھے اور میں حاضرِ خدمت تھا۔ حضرت نے کئی دن سے غذا نہیں کی تھی۔ دوپہر کو خادم سے تاکید کی کہ اتنی دیر ہو گئی میاں شاہد کو کھانا نہیں کھلایا، جلد کھانا منگواؤ۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ چار پانچ دن سے حضرت نے غذا نہیں کی ہے شاید آج کچھ خواہش معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ تاکید فرما رہے ہیں کہ سب مہمان کھانا کھالیں تو شاید حضرت کچھ نوش فرمائیں۔ اس خیال کے آتے

ہی مجھ سے آنکھ ملا کر فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے۔ مجھ کو بھوک لگتی ہے مگر خدا نے مجھ کو صبر دیا ہے۔ وصال سے ایک سال قبل حضرت نے غذا قطعی ترک کر دی تھی صرف صبح وشام دونوں وقت بے دودھ کی چائے پی لیتے تھے۔ پانچ مہینے قبل سے چائے بھی ترک کر دی تھی صرف خوب ٹھنڈا پانی دو چار گھونٹ نوش فرما لیتے تھے۔ اس ترکِ غذا سے حضرت کی معمولی تندرستی پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

حضرت جس قدر معذور تھے اس سلسلہ میں کوئی اتنا معذور نہیں ہوا تھا۔ معذوری کی ابتدا یوں ہوئی تھی کہ اپنے پیرو مرشد کے سامنے حضرت اُکڑوں بیٹھ کر وضو فرما رہے تھے۔ حضرت کے پیرو مرشد قطب الہند حضرت شاہ غلام معین الدین قدس سرہٗ گھٹنے کے درد سے معذور تھے۔ حضرت کو اُکڑوں بیٹھے وضو کرتے دیکھ کر فرمایا کہ "حلیم! تم اب تک اُکڑوں بیٹھ کر وضو کر لیتے ہو؟" حضرت فرماتے تھے کہ اُسی وقت میرے گھٹنے میں درد شروع ہوا اور میں اُس وضو کو اُکڑوں بیٹھ کر تمام نہ کر سکا مولوی عبدالمجید صاحب کاتب مصنف "سمات الاخیار" نے اس گھٹنے کے درد کے متعلق ایک قطعہ بہت ہی نفیس لکھا ہے

مُرشد میں تجھ میں فرق بس اب کچھ نہیں رہا ∴ سیرت میں حصے شیخ سے سب بیش وکم لئے
پس ماندہ رہ گیا تھا بس اک دردِ پا غریب ∴ اس نے بھی دوڑ دھوپ کے تیرے قدم لئے

آخر زمانے میں حضرت کی معذوریوں کا یہ عالم تھا کہ نماز بھی اشارے سے پڑھتے تھے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ کے زمانے میں جب جرمنی کو فتح ہوتی جاتی تھی سید احمد مرحوم بھی جو ڈاکٹر محمود کے بڑے بھائی تھے حاضرِ خدمت تھے حضرت نے ایک دن فرمایا کہ ذرا میں چلنے کی کوشش کروں دیکھوں کہ میں چل سکتا ہوں یا نہیں؟ ایک طرف سے میں نے اور دوسری طرف سے سید احمد مرحوم نے حضرت کی بغل میں ہاتھ دیکے اٹھایا حضرت اپنے کمرے سے خلوت کے دروازے تک آئے اور وہیں سستانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سید احمد مرحوم نے عرض کی کہ حضرت! فرما دیجئے کہ جرمن جیت جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے کہنے سے کیا ہوگا؟ سید احمد مرحوم نے کہا کہ حضرت! میرا ایمان ہے کہ اگر آپ فرما دیں گے کہ "جرمنی جیت جائے گا" تو یقیناً جرمنی جیت جائے گا۔ حضرت نے مُسکرا کر برجستہ یہ شعر فرمایا ؎

جو کہیں ہم زبان سے ہو جائے ∴ منہ میں لیکن کہیں زبان بھی ہو

میں نے اُسی وقت سمجھ لیا کہ نتیجے میں جرمنی ہی کو شکست ہوگی۔ اُسی جنگ کے متعلق ایک اور واقعہ یاد آیا کہ جب روس نے مشہدِ مقدس میں حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہٗ کے روضہ پر گولہ باری کی تھی حضرت بہت متاثر خاموش بیٹھے ہوئے تھے عصر کے بعد کا وقت تھا، میں پاؤں دبا رہا تھا، حضرت نے سکوت توڑ کر مجھ سے فرمایا کہ روس نے مشہدِ مقدس میں بہت بڑی گستاخی کی ہے اور تین مرتبہ یہ جملہ فرمایا کہ روس بہت تباہ ہوگا۔ روس کی بربادی کا مجھ کو اُسی وقت یقینِ کامل ہو گیا مگر زارِ روس

کے اس سطوت و جبروت کو دیکھتے ہوئے جب اسباب ظاہر پر غور کرتا تھا تو کوئی ذریعہ بربادی کا میرے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ جب ۱۹۱۴ء کی لڑائی چھڑی اُس وقت یہ معمہ سمجھ میں آیا کہ یہ سارا کھیل روس کی بربادی کے لیے ہو رہا ہے اور زارِ روس کو جتنی ذلتیں ایک انسان کے لیے ہو سکتی تھیں وہ سب ہوئیں۔ جو اظہر من الشمس ہے۔

حضرت کی زبانِ مبارک سے ایک مرتبہ یہ جملہ سُننے میں آیا کہ اب اولیاء اللہ کو اپنی کرامت ظاہر کرنے کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ملی بلکہ وہ مامور ہیں کہ اپنی کرامتوں کو چھپائیں۔ حضرت کے وصال کے قریب کوئی مرض ظاہری نہیں پیدا ہوا، غلبۂ استغراق بڑھتا گیا۔ میں دو ایک مہینہ قبل خدمت سے غیر حاضر تھا۔ وصال سے چند روز پہلے حافظ نبی بخش مرحوم سے حضرت نے فرمایا کہ "میاں شاہد آرہے ہیں اُن کے لیے مکان صاف کر دے۔" دس دن قبل سے کلام ترک کر دیا تھا اُس دس دن میں نواسی صاحبہ سے یہ فرمایا تھا کہ میں بہن برہ شریف جاؤں گا۔ نواسی صاحبہ نے عرض کی کہ آپ کی حالت سفر کے لائق نہیں ہے تو فرمایا کہ میں نہیں تو میری لاش جائے گی۔ چند مہینے قبل سے استغراق کی حالت میں حاضرین پر ایسی ہیبت طاری ہوتی تھی کہ کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ لوگ پاؤں دبا کے آتے تھے اور پلنگ کی پٹی چوم کے چُپکے سے بیٹھ جاتے تھے کسی کو سلام و کلام کی ہمت نہ ہوتی۔ اُس حالت میں جس کے بارے میں جو منہ سے نکل جاتا وہ فوراً ہو جاتا۔ حضرت جب پھر اس عالم کی طرف متوجہ ہوتے تو پھر سب سے اُسی طرح باتیں کرتے جیسے پیشتر کیا کرتے تھے اور ہیبت مٹ جاتی تھی جب حضرت نے حافظ نبی بخش مرحوم سے میرے آنے کے بارے میں فرمایا تو حافظ صاحب نے گورکھپور میرے نام تار روانہ کیا۔ میں اُسی دن گورکھپور سے روانہ ہو کر دوسرے دن صبح کو غازی پور پہنچا۔ میرے ساتھ مولوی محمد اصغر صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ میں پائینتی کی پٹی چوم کے دست بستہ خاموش کھڑا رہا۔ حضرت کے چہرۂ مبارک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جمالِ حقیقی کو بڑی محویت سے مشاہدہ فرما رہے ہیں۔ ٹکٹکی آسمان کی طرف لگی ہوئی تھی اور آنکھوں کی گردش سے ذکر جاری تھا۔ کچھ کچھ دیر کے بعد اللہ کا لفظ منہ سے نکلتا تھا۔ وصال سے چند منٹ پیشتر مولوی محمد اصغر صاحب نے فرمایا تھا کہ نبض میں کوئی تغیر نہیں ہے۔ نبض کی حالت آج کل کے تندرست نوجوانوں سے بہتر ہے۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ان لوگوں کی نبض کا اعتبار نہیں ہے ہم لوگ یہی گفتگو کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے آکر کہا کہ نبض غیر منتظم ہو گئی ہے۔ دوسری تاریخ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ ہجری تھی اور اتوار کا دن تھا کہ حضرت نے دن کے ایک بج کر بیس منٹ پر ہم گنہگاروں کو داغِ مفارقت دیا اور اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔ حضرت نے اپنے مزار کے لیے جو جگہ مجھ سے فرمائی تھی اُس کو میں نے ظاہر کر دیا تھا۔ اعزا نے لاشِ مبارک کو جونپور یا بہن برہ شریف جانے

نہیں دیا۔ میں نے رفعِ فتنہ کے لحاظ سے سکوت اختیار کیا حضرت کے مکان کے سامنے اُفتادہ زمین تھی اُس میں اُسی روز نصف شب کے بعد مدفون ہوئے۔ عُرس دوسری جمادی الاولیٰ کو شہر غازی پور محلہ نورالدین پورہ" میں مزارِ مبارک پر ہوا کرتا ہے۔

وصال کی تاریخیں ہر طرف لوگوں نے کہیں جن کی تعداد ہزاروں ہے۔ مولوی محمد احمد صاحب ایمن سکندر پوری نے بھی لقد رضی اللہ عنہ سے خوب تاریخ نکالی ہے۔ دو تاریخیں اس گنہگار نے بھی نکالیں۔ ایک تو یہ ہے ؎
۱۳۳۵ھ

قطبِ دوراں شیخِ ما عبدالعلیم	چوں بحق واصل شُد از راہِ نیاز
دستگیرش چوں بخواند او را حلیم	عفو و لُطفش زاں شدہ عاصی نواز
مثلِ عرشس از پرتوِ خلقِ عظیم	بُود اورا دامنِ رحمت دراز
بہرِ تاریخش چو فانیؔ فکر کرد	ایں صدا آمد ز خلوت گاہِ راز
شد جہاں بے او بچشمِ من سیاہ	محوِ ذاتِ اللہ حلیم پاک باز

۱۳۴۲-۷ = ۱۳۳۵ھ

دوسری تاریخ میں نے قرآنِ پاک سے نکالی تھی۔ اس آیۂ مقدس میں جتنی باتیں درج ہیں وہ حرف بحرف حضرت پر گزری تھیں اور رجا اللہ تعالیٰ نے جزا عطا فرمائی وہی مادۂ تاریخ ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۚ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ

۱۳۳۵ھ

اس تاریخ پر بہت سے لوگوں نے رشک کیا اور اُولٰٓئِکَ کے ہمزہ پر اعتراض کیا کہ ہمزہ کا عدد شمار کیا گیا ہے۔ میں نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ ہمزہ کا ایک عدد لیجئے چاہے کوئی عدد نہ لیجئے دونوں صورتوں میں تاریخ صحیح باقی رہتی ہے۔ اس لیے کہ کتابتِ قرآنی اس آیتِ کریمہ میں صَلَوٰتٌ کے لفظ میں الف کے ساتھ اور بغیر الف دونوں طرح سے وارد ہے۔ اگر اُولٰٓئِکَ کے ہمزہ کا ایک عدد لیتے ہیں تو صَلَوٰتٌ کا لفظ بغیر الف کے لکھا جائے گا اور اگر آپ کے نزدیک ہمزہ کا کوئی عدد نہیں لیا جائے گا تو صَلَوَاتٌ میں واؤ کے بعد الف لکھا جائے گا۔

ناظرینِ کرام سے استدعا ہے کہ اس گنہگار کو دعائے خیر سے یاد کریں اور میری خطاپوشیوں میں عالی ہمتی سے کام لیں۔

راقم
شاہد علی سبز پوش علیمی رشیدی غفرلہٗ
گورکھپور

غزل

"ردیف ا"

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
مُنہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

پاؤں یا رب مجھے تاجِ سرِ منزل دینا
ہاتھ بھی گردنِ مقصد میں حمائل دینا

غیرِ ظاہر نہ مظاہر کی حقیقت سمجھوں
اتنی تمیز میانِ حق و باطل دینا

ذوق میں صورتِ موج آکے فنا ہو جاؤں
کوئی بوسہ تو بھلا اے لبِ ساحل دینا

رشکِ خورشیدِ جہاں تاب دیا دل مجھ کو
کوئی دلبر بھی اسی دل کے مقابل دینا

اصلِ فتنہ ہے قیامت میں بہارِ فردوس
جُز ترے کچھ بھی نہ چاہے مجھے وہ دل دینا

تیرے دیوانے کو بے حال ہی رہنا اچھا
حال دینا ہو اگر رحم کے قابل دینا

ہائے رے ہائے تری عقدہ کشائی کے مزے
تو ہی کھولے جسے وہ عُقدۂ مشکل دینا

خوں فشانی ہو مری آئینۂ روئے فنا
دونوں آنکھوں کو رگِ گردنِ بسمل دینا

ناتوانوں کے سہارے کو ہے یہ بھی کافی
دامنِ لطفِ غبارِ پسِ محمل دینا

سرِ دشمن سے کہیں[1] آگ بھڑکتی[2] دیکھی
شمع ساں مجھ کو سرافرازیٔ محفل دینا

تہمتِ[3] دل دہیٔ غیرِ ہوس کیش غلط
آپ معشوق ہیں کیا جانیں بھلا دل دینا

نقدِ جان و دل اِدھر دولتِ دیدار اُدھر
اُن کو لینا بہت آسان ہے، مُشکل دینا

رہ[4] کے آغوش میں اے بحرِ کرم عاشق کو
قسمتِ سوختۂ سبزۂ ساحل دینا

تنگیٔ غنچۂ پژمردہ ہو صحرائے وسیع
اس قدر کلفتِ افسردگیٔ دل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

وعدہ کرنے سے بھی تنگیٔ دہن نے روکا
بوسہ کیسا کہ زبان اُن کو ہے مشکل دینا

---

[1] کبھی [2] بھڑکتے [3] دل دہی غیر کی اور آپ، یہ سچ ہے کہ غلط
[4] وصل بھی فصل ہے میرے ہی لیے اے یمِ حسن

(۲)

اُسی کے جلوے تھے لیکن وصالِ یار نہ تھا
میں اُس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا

کوئی جہان میں کیا اور طرح دار نہ تھا
تری طرح مجھے دل پر تو اختیار نہ تھا

خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا

وہ کون نالۂ دل تھا قفس میں اے صیّاد
کہ مثلِ تیرِ نظر آسماں شکار نہ تھا

غلط ہے، حکمِ جہنّم کسے ہوا ہوگا
کہ مجھ سے بڑھ کے تو کوئی گناہگار نہ تھا

وفورِ بے خودئ بزمِ مے نہ پوچھو، رات
کوئی بجز نگہِ یار ہوشیار نہ تھا

لحد کو کھول کے دیکھو تو اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مُستعار نہ تھا

تو محوِ گلبن و گلزار ہو گیا آسیؔ
تری نظر میں جمالِ خیالِ یار نہ تھا

(۳)

دوں پتا دردِ دل میں فانی کا بھیس سارا ہے یارِ جانی کا

کس سے کیا ہو سکا بڑھاپے میں کس کو ماتم نہیں جوانی کا

دردِ دل لُطفِ زندگانی ہے غم سبب عیشِ جاودانی کا

تیشۂ کوہکن نے خوب لکھا ماجرا میری خوں فشانی کا

نقشِ پا کو کوئی اٹھا نہ سکا دیکھنا زور ناتوانی کا

غم نے خم کرکے جسمِ لاغر کو خوب چھلّا دیا نشانی کا

آبرو ہو جو دل میں رقّت ہو دیکھ موتی ہے قطرہ پانی کا

غیر کا اب گزر نہیں دل تک عشق عہدہ ہے پاسبانی کا

دہنِ تنگِ یار کا حلقہ دَور ہے جامِ لن ترانی کا

نہ نمک عشق کا نہ زخمی دل کچھ نہ پایا مزا جوانی کا

ہم تو آسیؔ انہیں بلا لائیں
کیا ہے سامان میہمانی کا

(۴)

غمزے ہیں جس میں حسن کے عشق ہے اُس نگار کا
چوٹ ہے جس میں عشق کی حسن ہے میرے یار کا

لاکھ گلے لگائیں وہ رنگ نہیں قرار کا
موجۂ بوئے گل ہوں میں ان کے گلے کے ہار کا

طوفِ حرم میں قول تھا تیرے شراب خوار کا
حلقۂ کعبہ دَور ہے بادۂ خوش گوار کا

جوشِ بہار و سوزِ عشق دونوں[1] یہ ایک ہی نہ ہوں
رنگ ہے لالہ زار میں سینۂ داغ دار کا

تجھ سے بھی کوئی ماہ رُو پردے میں چھپ گیا مگر
کچھ سبب آخر ابرِ تر! گریۂ زار زار کا

موجۂ خندہ، موجِ خوں صورتِ غنچہ کس لیے
کیوں ہو ہنسی سے آشنا مُنہ کسی دل فگار کا

زخمِ جگر سے خونچکاں گزرے ہیں تیرے خستہ جاں
جادۂ منزلِ عدم تختہ ہے لالہ زار کا

سُرمۂ چشمِ نقشِ پا ہم ہوئے تیری راہ میں
کوئی پِسا ہوا نہ ہو صدمۂ انتظار کا

---

[1] اصل میں

گردنِ جاں جھکائے ہے کس لیے ہر نیاز مند
موت بھی کوئی وار ہے خنجرِ نازِ یار کا

خوشہ گہروں کو پیس کر گردشِ آسیائے چرخ
سُرمہ بناتی رہتی ہے دیدۂ اعتبار[1] کا

ڈھائی تھی جائے قصرِ چرخ ہستیِ غیر کی بِنا
کُشتۂ امتیاز ہوں دیدۂ اشک بار کا

ایک نظر میں جو کرے دونوں جہان کو خراب
دل ہے نظارہ جُو اُسی آفتِ روزگار کا

محشرِ وعدہ آ ابھی بات ہے اس میں بھید کی
خون تو اپنے سر نہ لے کُشتۂ انتظار کا

دل کی کشود ہوتے ہی جلوۂ بے حجاب تھا
دل جسے سمجھے تکمہ تھا بُرقعِ روئے یار کا

جائے طوافِ حلقۂ دورِ شرابِ ناب ہو
شیخِ حرم مُرید ہے آسیؔ بادہ خوار کا

آسیِؔ نامراد پر ہے وہی جلوہ جس سے ہے
مطلعِ آفتابِ حشر ذرّہ مرے غبار کا

---

[1] بمعنی عبرت گرفتن

۵

عاشق کی جاں گئی پر تنہا نہ یار رویا
جس سنگ دل نے دیکھا بے اختیار رویا

ہمدرد کی مصیبت دیتی ہے کیا اذیت
بلبل نے نالے کھینچے میں زار زار رویا

رقت سے وقتِ رخصت تھا دیکھنا بھی مشکل
جب آنکھ اُدھر اٹھائی بے اختیار رویا

اُنؔ کی گلی میں جاکر سوت آنسوؤں کے پھوٹے
یہ پھوٹ پھوٹ کر میں زیرِ مزار رویا

برباد کر دیا جب قسمت نے گلستاں سے
ابرِ بہار بن کر میرا غبار رویا

ثابت جو ہو رہی تھی گلشن کی بے ثباتی
جوں جوں ہنسے گلِ تر میں زار زار رویا

اظہارِ سوزِ دل کو آسیؔ نے شمع آسا
جوں ہی زبان کھولی بے اختیار رویا

ل اُس کی

(۶)

گلوئے خشک خواہاں ہے دمِ تکبیر پانی کا
ذبیحے سے نہ کر بخل اے دمِ شمشیر پانی کا

لگی دل کی بجھاتے ہیں جو کھل جاتے ہیں دانت اُن کے
یہ موتی کام کرتے ہیں دمِ تقریر پانی کا

ہوئی کیا شمع پانی پانی اُس کے روئے روشن سے
جو[1] تو گُل لے تو قطرہ نکلے اے گُل گیر پانی کا

مری کِشتِ امل پر ابرِ رحمت بھی[2] اگر برسے
تو بجلی سے اثر بدلے مری تقدیر پانی کا

ہُوا جو بے حقیقت، خود بخود سرسبز رہتا ہے
نہیں محتاج نخلِ گلشنِ تصویر پانی کا

جو قسمت ہی میں خاک اُڑتی ہو سیرابی کہاں ممکن
لبِ ساحل کی صورت گو ہو دامن گیر پانی کا

خدنگِ[3] آہ نکلا جب کلیجا ہو گیا پانی
ہُوائے[4] تیر سنتے تھے یہ دیکھا تیر پانی کا

مقدّر میں ہو یوں سب کچھ مگر تدبیر لازم ہے
کہ اک قطرہ نہیں ملتا ہے بے تدبیر پانی کا

---

[1] اگر [2] ہو کرم فرما [3] خدنگِ آہ کیا نکلا [4] کوئی تیرِ ہوائی ہے تو ہے یہ تیر پانی کا

کسی[1] سائل کو کیا پھیرے جو خود دن رات سائل[2] ہو
لگا یہ دل میں آ کر شعلۂ تقدیر پانی کا

پیا جو آبِ آتش رنگ چہرہ ہو گیا کُندن
اثر دیکھا کسی نے[3] روکشِ اکسیر پانی کا

وہ پانی ہے کہ موتی بن کے پہونچا اُن کے کانوں تک
نہ کیونکر رشک ہو اے اشکِ بے تاثیر پانی کا

دمِ تحریر اشکوں نے لگائی کیوں جھڑی مینہ کی
نہ تھا سائل ہمارا خامۂ تحریر پانی کا

ترا سرگشتۂ اُلفت یہ روتا ہے اسیری میں
کہ بنتا ہے بھنور ہر حلقۂ زنجیر پانی کا

جو شرحِ مصحفِ عارض لکھے گا عاشقِ گریاں
بنے گا بلبلہ ہر نقطۂ تفسیر پانی کا

ہم اپنی تشنہ کامی کی[4] شکایت کیا کریں آسیؔ
گیا شاکی گلوئے حضرتِ شبیرؓ پانی کا

---

[1] کوئی [2] بمعنی سیال [3] میں [4] کا کریں کیا شکوہ اے آسی

۷

سرکٹانے کے لیے دل وہیں بے تاب ہُوا
مثلِ اَبرو کوئی خنجر جو سیہ تاب ہُوا

رتبہ پایا ہے محبت میں تو اب دل کو سنبھال
گر پڑے گا صفتِ برق جو بے تاب ہُوا

خاکساری سببِ آبروئے سالک ہے
جو مِلا خاک میں آنسو، دُرِ نایاب ہُوا

قابلِ سجدہ ہوا جھک کے ملا جو کوئی
قدِ خم گشتہ میں پیدا خمِ محراب ہُوا

ظرف اگر پائے تو نعمت سے کبھی سیر نہ ہو
پُر نہ دریا سے کبھی کاسۂ گرداب ہُوا

جس نے دیکھا تجھے کیا خاک لگے آنکھ اُس کی
دیدۂ رخنۂ دیوار بھی بے خواب ہُوا

خوب یک رنگیِ الفت کے تماشے دیکھے
روزِ پروانۂ بےکس شبِ سُرخاب ہُوا

بس[1] بھی کر اے مرے طوفانِ سرشک اب بس کر
روزنِ قصرِ صنم دیدۂ پُر آب ہُوا

اشکوں[2] نے تا بہ گلو آ کے وہ چکر باندھا
حلقۂ جیب مرا حلقۂ گرداب ہُوا

شعر وہ نور سے لبریز پڑھے آسیؔ نے
حلقۂ اہلِ سخن ہالۂ مہتاب ہُوا

---

[1] اُس گلی میں مرے اشکوں نے یہ طوفان کیا [2] ایک نسخہ میں یہ بھی ہے:-
(وصفِ دنداں نہ ہوا پھر تو خجالت ہے بڑی ؞ دُرِ مضموں صفتِ اشک تمام آب ہوا)

۸

عشقؔ میں اے کوہ کن کیا زخمِ سر درکار تھا
زخمِ دل درکار تھا، زخمِ جگر درکار تھا

اُڑ کے جانا بامِ جاناں تک مگر درکار تھا
مرغِ دل کو بازوئے مرغِ نظر درکار تھا

سوزِ دل سےؔ دستِ ماتم پنجۂ خور کس لیے
ہاں شبِ غم چاکِ دامانِ سحر درکار تھا

پاک بازی اپنی پیغامِ طلب تھیؔ عشق میں
دھو کے داغِ تہمتِ ہستی، سفر درکار تھا

قرض کی کچھ گفتگو عاشق سے کرتے تھے رقیب
نالے تو کچھ کم نہ تھے شاید اثر درکار تھا

اہل تھے محرومیٔ دیدار کے تم اے کلیم
میں ازل کا بے جگر، مجھ کو جگر درکار تھا

کیا شرابِ حسنِ ساقی جاں فزا تھی واہ وا
مے گسارو! ساغرِ ذوقِ نظر درکار تھا

چاک ہائے دل کے ٹانکے اتنی بے رحمی کیساتھ
دردِ دل تجھ کو بھی کچھ اے چارہ گر درکار تھا

داغِ غم اُس کو نہ جان اے بلبلِ جانِ حزیں
چلنے کو اس باغ سے برگِ سفر درکار تھا

مجھ سے بے مقدار کا دل اور جلوہ آپ کا
سچ ہے اے خورشید ہر ذرّے میں گھر درکار تھا

داغِ سوزاں چھوڑ کر عاشق نے لی راہِ عدم
پسرو! تم کو چراغِ رہ گزر درکار تھا

داغ اپنا دے کے آسیؔ نے جو لی راہِ عدم
پسرو! تم کو چراغِ رہ گزر درکار تھا

لذتِ آزارِ آسیؔ کے سمجھنے کے لیے
دردِ دل تجھ کو بھی کچھ اے چارہ گر درکار تھا

---

۱ سن تو اے فرہاد تجھ کو ۲ کو ۳ ہے ۴ عشق

۹

جب دلِ عاشق کو[1] یارائے شکیبائی نہ تھا
حشر کا وعدہ کبھی طورِ دل آرائی نہ تھا

لالہ و گل کا یہ دیوانہ تماشائی نہ تھا
باغ میں ہر پھول تیرے حسن کا آئینہ تھا

حسن پھر کس کام کا جب چاہنے والا نہ ہو
سچ ہے تجھ سے دل رُبا کو لطفِ تنہائی نہ تھا

گلشنِ دیدار میں کوری بھی رکھتی تھی بہار
آنکھ وہ نرگس تھی جس میں رنگِ بینائی نہ تھا

آگیا بارے خیالِ وعدۂ فردائے حشر
اے لحد کوئی انیسِ کنجِ تنہائی نہ تھا

پیشِ ناصح اور اتنی بے قراری کیا کہوں
سامنے وہ آگیا وقتِ شکیبائی نہ تھا

اب وہی دیکھیں دلِ شیدا میں کس کی شکل ہے
مبتلا کرنا مرا شایانِ یکتائی نہ تھا

صورتِ خورشید ناجنسوں سے نفرت ہی رہی
گو مجھے کچھ ذوقِ دورِ جام تنہائی نہ تھا

دولتِ پابوس پاکر کیوں نہ ہوتا سر بلند
میں تو اے زُلفِ درازِ یار سودائی نہ تھا

حدِ حیرت دیکھتا[2] تھا اپنی آرائش کے ساتھ
آئینہ خانہ میں وہ محوِ خود آرائی نہ تھا

ایک ہی جلوہ میں اُس کے ہوگیا جل بھُن کے خاک
عاشقِ جاں سوز تھا میں، کچھ تماشائی نہ تھا

مَر[3] گیا میں رند، ساقی نے خبر میری نہ لی
کیا مئے گل رنگ میں رنگِ مسیحائی نہ تھا

مُنہ چھپا کر گھر میں بیٹھا جو[4] ترا مُنہ دیکھ کر
وہ[5] دلِ حیراں مرا تھا یا ترا آئینہ تھا

شرط[6] تھا راہِ طلب میں آبلہ فرسا قدم
بے سبب نالوں کو ذوقِ چرخ فرسائی نہ تھا

کوئی نکلا بھی مقابل تو مجھی سے فیض یاب
گو بسانِ خور مجھے دعویٰ یکتائی نہ تھا

وہ ہجوم[7] اشتیاق و حسرت و غم ہائے ہائے
ان سے ملنے کے لیے امکانِ تنہائی نہ تھا

---

[1] میں [2] دیکھنا [3] ہم گدایانِ درِ مے خانہ مرتے کس طرح [4] دیکھ کر جو منہ ترا
[5] یا مرا دل تھا ہی ویسا یا ترا آئینہ تھا [6] آرزوئے وصل تو ہر وقت گھیرے رہتی تھی
[7] ایک میلا تھا ہجومِ آرزو کا رات دن

اے[1] شبِ مہ کیوں نہ راتیں میری نورانی ہوئیں	کیا میرے مُنہ پر کہیں داغِ جبیں سائی نہ تھا
گلشنِ کوئے صنم سے کیوں[2] نکلتا میں کبھی	مثلِ مجنوں بلبلِ گل ہائے صحرائی نہ تھا
آ گیا اے گریۂ غم اُس اندھیری رات میں	اے جز اک اللہ کوئی غم خوارِ تنہائی نہ تھا
جو نہ بوجھ اُٹھا کسی سے وہ اُٹھایا کس طرح	ضعفِ خلقی میں اگر جوشِ توانائی نہ تھا
دل[3] میں تو ہر وقت حاصل تھا مجھے اُس کا طواف	کعبے پھر کیا کرنے جاتا یار ہرجائی نہ تھا

رو کے آسی پوچھتا تھا کب قیامت آئے گی
کس طرح کہیئے کہ وہ تیرا تمنائی نہ تھا

---

[1] میری راتوں کو نہ مثلِ ماہ نورانی کیا [2] میں نکلتا کس طرح

[3] ایک بیاض میں یہ بھی ہے (دل تو ٹکڑے ہو چکا تھا دم نہ مارا میری طرح : کیا لبِ غنچہ میں بھی یارائے گویائی نہ تھا)

۱۰

کہا یہ دیکھ کر خالِ بُتِ بے پیر کا دانا
الٰہی اس کو تو کرنا مری تقدیر کا دانا

نہیں رہتا ہے بے پہونچے ہوئے تقدیر کا دانا
لبِ سوفار تک پہونچا دلِ نخچیر کا دانا

جو دانا ہے تو دیوانوں کے قدموں سے تو لپٹا رہ
مُسلسل یہ صدا دیتا ہے ہر زنجیر کا دانا

حقیقت دار کے اوصاف کیا ہوں بے حقیقت میں
کہاں ہے قابلِ نشو و نما تصویر کا دانا

بھلا ہم چشم ہو سکتا ہے موتی روزنِ دل سے
یہ ہے چھیدا ہوا اُن کی نظر کے تیر کا دانا

بسانِ آسیا پائے توکّل کو نہ لغزش دے
کہ منہ میں آ رہے گا خود بخود تقدیر کا دانا

جو آیا منہ تک اُڑ بھاگا ہوائے شعلۂ غم سے
سپندِ آتشِ دل ہے مری تقدیر کا دانا

دلِ پُر نورِ محوِ یادِ ابرو پر یہ پھبتی ہے
کہ ہے دھویا ہوا آبِ دمِ شمشیر کا دانا

ستارے کی چمک دیکھی نہ تھی موتی کے دانے میں
دُرِ دنداں ترا ہے واہ کس تنویر کا دانا

جو ہے بے ذوق کب ملتی ہے لذّت دار شے اُس کو
جلا گل ہے دہانِ بے حِسِ گل گیر کا دانا

مزا کیا جبکہ دانے کے لیے کی[1] آبرو ریزی
ہمیشہ مجھ کو دینا اے خدا توقیر کا دانا

حلاوت روح کو، دل کو، جگر کو جس سے ملتی ہے
ترا خالِ لبِ شیریں ہے کس تاثیر کا دانا

تصوّر اس قدر باندھا ہے نقشِ نامِ اقدس[2] کا
کہ تل ہر آنکھ کا ہے نقطۂ شبیر کا دانا

کسی سے طالبِ ناں کس لیے شیخِ ریائی ہو
اُسے کافی ہے اپنی سبحۂ تزویر کا دانا

دکھا کر خالِ ابرو جو چھُری پھیری تھی گردن پر
نہ بھولا طائرِ دل وہ دمِ تکبیر کا دانا

ہُوا سُرمے کے تل سے رنگ اُن گالوں میں کُندن کا
نزاکت ہے سبب اس کا کہ ہے اکسیر کا دانا

مرے آنسو جو[3] پوچھے یار نے دھانی دوپٹے سے
ہوا سرسبز آخر اشکِ بے تاثیر کا دانا

کبھی تدبیر سے غیر از مقدر مل نہیں سکتا
جو ہے تقدیر کا دانا وہ ہے تدبیر کا دانا

کتابت پیشہ کی روزی کی کیا موہوم ہوتی ہے
سوائے نقطہ کیا ہے خامۂ تحریر کا دانا

لگایا مُنہ کہ چوموں خالِ لب پہلو سے اُٹھ بھاگے
چھنا مُنہ سے دہانِ آسیِ دل گیر کا دانا

---

[1] ہو [2] حضرت [3] بھی

(۱۱)

قید بھی کوئی نہ ذکرِ قیدی و زنجیر تھا ٭ دل مرا اُس وقت اسیرِ گیسوئے بے پیر تھا

عشق میں، کہتے ہیں، کامل آسی دل گیر تھا ٭ آہ جس کی بے اثر تھی نالہ بے تاثیر تھا

سنگ[۱] دل جو رات سُن کر قائلِ تاثیر تھا ٭ شعرِ آسی تھا کوئی یا نالۂ شب گیر تھا

حالتِ دل خاک میں کہتا کہ تا ہنگامِ مرگ ٭ آپ کا شکرِ جفا یا شکوۂ تقدیر تھا

کوچۂ[۲] جاناں سے جیتے جی نہ پھر نکلا جو میں ٭ چشمِ نقشِ پا میں شاید سرمۂ تسخیر تھا

جس طرف سے ہو کے گزرا چھید ڈالے دل جگر ٭ نالۂ غم تھا کہ مژگانِ صنم کا تیر تھا

میں[۳] جسے سُن کر حیاتِ جاودانی پا گیا ٭ وہ دمِ ذبح اُس کے منہ سے نعرۂ تکبیر تھا

عشق سے فرہاد کے پردے میں پایا انتقام ٭ ایک مدت سے ہمارا خون دامن گیر تھا

سچ بتانا اے نگاہِ ناز تیرے بھیس میں ٭ کس قدر انداز کے دست و کماں کا تیر تھا

تو نے گھونگھٹ کیا اُٹھایا لگ گئی عالم میں آگ ٭ جلوہ یا کوئی شرارِ آہِ پُر تاثیر تھا

یار تک پہونچا تو میں لیکن فنا ہونے کے بعد ٭ جادۂ راہِ طلب تھا یا دمِ شمشیر تھا

باغ میں جا کر پھر آنا چھپ کے رات اُن کا غلط ٭ کیوں برنگِ غنچہ ہر برگِ چمن دل گیر تھا

عشق کیا کیا نسبتیں کرتا ہے پیدا حُسن سے ٭ زلف اگر شب رنگ تھی نالہ مرا شب گیر[۴] تھا

نالوں کی عرضِ تمنّا دیکھنا تھا دیدنی ٭ دیدہ حیرت خانۂ بیتابیِ تقریر تھا

وہ مصوّر تھا کوئی یا آپ کا حسنِ شباب ٭ جس نے صورت دیکھ لی اک پیکرِ تصویر تھا

---

[۱] سنگ دل بھی سن کے دل میں قائلِ تاثیر تھا ٭ شعرِ آسی تھا کہ میرا نالۂ شب گیر تھا۔
[۲] سرزمینِ کوئے جاناں کیوں نہ چھوڑی جیتے جی
[۳] جس صدا سے میں نے پائی زندگیٔ جاوداں ٭ وہ دمِ ذبح اُن لبوں سے نعرۂ تکبیر تھا
[۴] بمعنی روندۂ شب، غیاث اللغات وغیرہ

امتیازِ صید و صید افگن نہ تھا جس عہد میں
تیرے فتراکِ نظر کا مرغِ جاں نخچیر تھا

برق ہستی سوز تھی یا حسن روئے بے نقاب
دیکھنا اُس شوخ کا مرگِ جوان و پیر تھا

ظاہر و مظہر اگر باہم نہیں تھے حسن و عشق
بلبلیں رنگیں نوا کیوں، غنچہ کیوں دل گیر تھا

ناشگفتہ گلشنِ ہستی سے جو جاتا رہا
وہ دلِ پُر آرزو یا غنچۂ تصویر تھا

کس طرح سمجھوں کہ عشقِ غیر کا تھا اعتبار
کب وہ میری طرح اس محفل میں بے توقیر تھا

پائے بوسِ آسیؔ دیوانہ کا اللہ رے شوق
حلقۂ چشمِ تصوّر حلقۂ زنجیر تھا

حق ہو یا ناحق، کہا تم نے، ہوا بدنام میں
اب تو ثابت ہو گیا منصور بے تقصیر تھا

(١٢)

سجدۂ در جو تمہارا نہ میسّر ہوتا — وہی ہم ہوتے، وہی سر، وہی پتھر ہوتا

خار، خارِ غمِ اُلفت کی اگر حد ہوتی — رُوکشِ وادیِ مجنوں نہ مِرا گھر ہوتا

ہجر کی رات بھی پہلو کو نہ خالی پایا — غم تمہارا دلِ عاشق میں نہ کیوں کر ہوتا

بزمِ مے میں تو نکلتی کبھی بوسے کی ہوس — لبِ عاشق ہی الٰہی لبِ ساغر ہوتا

اور کر دیتی ہے بسمل نگہِ لطف اُس کی — رحم آتا ہی کسی دن جو ستم گر ہوتا

دل ہی سینے میں نہیں کون کرے بے تابی — لاکھ صدمے دو مجھے، میں نہیں مضطر ہوتا

خیر آجاتی قیامت تو قیامت ہی سہی — دیکھ لینا تو کسی طرح مُیسّر ہوتا

نہ تڑپتے کبھی اس ضعف میں ہم ذبح کے بعد — جو نظارا نہ تمہارا تہِ خنجر ہوتا

عشق غارت ہو کہیں مار ہی ڈالا مجھ کو — نقدِ جاں دے کے تو اک بوسہ میسّر ہوتا

دل میں وہ آئے مگر ناز نہ کر اس دل پر — یعنی[1] آتے وہ عدو کا نہ اگر گھر ہوتا

شکلِ ابروئے مہِ نو میں وہ کہاں جوہرِ قتل — کیا فلک بھی مرے قاتل کے برابر ہوتا

چشمۂ خور میں نہ کیوں محو ہوا مثلِ حباب — ایک ذرّہ نہ ترے حکم سے باہر ہوتا

تم لپٹ جاتے اگر آ کے مرے پہلو سے — نالہ شرمندہ نہ سینے سے نکل کر ہوتا

کوئی ہو، آنکھ ملاتے ہوئے، تھا کام تمام — مثلِ تارِ نگہِ یار میں لاغر ہوتا

عرش پر کہیے تو اثباتِ مکاں ہوتا ہے — کیا فلک بھی مرے سینے کے برابر ہوتا

چاہتا تھا کسی خوش چشم کو اے حسرتِ زخم — موئے مژگاں رگِ جاں کے لیے نشتر ہوتا

مر گیا آسیِؔ دل گیر بھی انّا للہ
مرضِ عشق سے کوئی بھی تو جاں بر ہوتا

---

[1] کہیں

(۱۳)

ہم تو ڈرتے تھے کدھر حکم قضا نے بھیجا
بارے اے بُت ترے کوچے میں خدا نے بھیجا

تیرے کوچے میں جسے ہوئی ہوسِ حُور و قصور
کس جہنم میں اُسے حرص و ہوا نے بھیجا

شام سے تا بہ سحر دیجے دُھنی اُس در پر
مژدۂ حسنِ قبول اپنی دُعا نے بھیجا

موقعِ کسبِ کمالات وہاں کس کو ملا
وہی اچھے جنہیں دنیا میں خدا نے بھیجا

خرقۂ فقر کے رُتبے عُرفا جانتے ہیں[1]
یہ وہ جامہ ہے جسے آلِ عبا نے بھیجا

عاقبت میں وہ نہیں جن کے فلک پر ہیں دماغ
خاک میں ملنے کو دُنیا میں خدا نے بھیجا

آسیؔ نامہ سیہ لائقِ دوزخ بھی نہ تھا
خُلد میں اُلفتِ شاہِ شُہدا نے بھیجا

---

[1] سے پوچھو

(۱۴)

غبار ہو کے بھی آسیؔ پھرو گے آوارا
جنونِ عشق سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا

وہ تیغِ حسن تو دشمن نہیں کسی کی مگر
جو آپ آ کے گلا ریتے کوئی، کیا چارا

وہ جلوہ، شعلہ تو، میں کاہِ ناتواں اے قیس
تجھے فراق نے مجھ کو وصال نے مارا

ہزار گرم ہو خورشیدِ روزِ حشر تو کیا
سما گیا ہو مگر دل میں کوئی مہ پارا

سلوکِ راہِ وفا میں فنا کے طور ہیں اور
جو آپ مار کے تیشہ مرا تو جھک مارا

ہزار شوق یہاں اور آدھی جان نہیں
ہزار جان وہاں اور ایک نظّارا

جفا نہ کم ہو اُدھر سے نہ آپ سیر ہو دل
بُرا ہے مشربِ غم، یہ مذاق ناکارا

نہ پوچھو حالتِ دل اُس غریقِ حسرت[1] کی
دکھائی دے جسے ایک ایک قطرے میں دھارا

نہ مستعدِ فنا ہو تو ذوقِ عشق غلط
کہ بہرِ جرمِ محبّت ہے قتل کفّارا

تمہاری دید قیامت نہیں تو پھر کیا ہے
کہ مجھ کو نورِ خدا کا ہے آج نظّارا

حقیقتِ دلِ بے تاب سوزِ غم میں نہ پوچھ
نظر پڑا ہے کہیں تجھ کو آگ پر پارا

تعیّنات میں کیا اختلاف ہوتا ہے
وہ بدرِ عالمِ حسن اور آنکھ کا تارا

نہ آپ کم ہو تپِ دل، نہ تم علاج کرو
تڑپ تڑپ کے مرا اب مریض بے چارا

نہ کیوں ہو غلغلۂ غم محیطِ مُلکِ وجود
کہ ڈاک سانس کی جاری ہے، عشق ہرکارا

فراقِ یار کی طاقت نہیں وصال محال
کہ اُس کے ہوتے ہوئے ہم ہوں یہ کہاں یارا

اگر بیانِ حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
تو شعر لغو ہے آسیؔ کلام ناکارا

---

[1] رحمت

(۱۵)

پسند آیا تو لے لو دل ہمارا — مگر دل پھر بھی کس قابل ہمارا
نہیں[1] ہوتا کہ بڑھ کر ہاتھ رکھ دیں — تڑپتا دیکھتے ہیں دل ہمارا
جمال اُن کا ہے آبِ زندگانی — مگر جینا کیا مشکل ہمارا
چھُری بھی تیز ظالم نے نہ کر لی — بڑا بے رحم ہے قاتل ہمارا
تموّج بحرِ غم کا دیکھتے[2] ہو — حُبابِ دل ہے دریا دل ہمارا
یہ گرمی آتشِ دوزخ میں کیسی[3] — کوئی نالا ہوا شامل ہمارا
تکلّم ہم سے یارِ بے دہن کا — نہ کیوں ہو مدّعی قائل ہمارا
نہ آنا ہم تمہارا دیکھ لیں گے — جو نکلا جذبِ دل کامل ہمارا
کبھی[4] ڈھونڈھا بھی تو نے ہم کو اے قیس — دلِ ہر ذرّہ ہے محمل ہمارا
دلِ گردوں سے لے کر تا دلِ دوست — گیا نالہ کئی منزل ہمارا
اگر[5] قابو نہ تھا دل پر بُرا تھا — وہاں جانا سرِ محفل ہمارا
نہ جانا کچھ طرازِ گنجِ اسرار — امانت دار تھا جاہل ہمارا
تأمل ہے جو پاس آنے میں اُن کو — وہاں جانا بھی لاحاصل ہمارا

مطلع

کوئی ہے جو نہ ہو حامل ہمارا — مگر ملنا ہوا مشکل ہمارا

---

[1] ایک بیاض میں یہ شعر بھی ہے (تھی اپنی زندگانی بدتر از مرگ ؎ مسیحا ہو گیا قاتل ہمارا) [2] اس میں دیکھو
[3] واعظ [4] کبھی ہم کو نہ ڈھونڈھا تو نے اے قیس
[5] نہ تھا جب دل ہی قابو میں بُرا تھا ؎ نہ قابو میں اگر دل تھا بُرا تھا

محیطِ رنگ نیرنگِ فنا ہیں — جمالِ دوست ہے ساحل ہمارا
بھلا وہ دشمنِ جاں دوست ہو گا — ہوا پندار اب باطل ہمارا
چلا سفاک یہ دل[1] میں نہ آئی — تڑپتا ہے ابھی بسمل ہمارا
محیطِ جادۂ بے رنگ ہے دل — کہیں پیدا نہیں ساحل ہمارا
یہ حالت ہے تو شاید رحم آجائے — کوئی اس کو دکھا دے دل ہمارا
دمِ نزع آنے کا وعدہ تو دیکھو — کہ اب مرنا بھی ہو مشکل ہمارا
انہیں کی چھیڑ تھی اس رنگ میں بھی — خیالِ غیر تھا باطل ہمارا
طلب اُن کی، پھریں ہم گرد اپنے — جنونِ عشق تھا کامل ہمارا
متاعِ گرمیِ بازارِ جاں ہے — وہ برقِ خرمنِ حاصل ہمارا
مزا ہر آن میں ہے شانِ نو کا — مگر جب دل نہ ہو غافل ہمارا

وہ کاش اتنا قیامت میں تو پوچھیں
کہاں ہے آسیِ بے دل ہمارا

---

[1] جی میں نہ آیا

۱۶

تو رات جہاں جلوۂ کاشانۂ دل تھا
آج اس کو جو دیکھا تو وہ ویرانۂ دل تھا

نقشِ دو جہاں گردشِ پیمانۂ دل تھا
کُن روزِ ازل نعرۂ مستانۂ دل تھا

اے پیرِ مغاں خون کی بُو ساغرِ مے میں
توڑا جسے ساقی نے وہ پیمانۂ دل تھا

ذوقِ غم و اندوہِ محبت کے ہیں صدقے
جو داغ دیا تم نے وہ جانانۂ دل تھا

خوشبو وہی، رنگت وہی، مستی بھی اُسی کی
کعبہ میں بھی دورِ مئے میخانۂ دل تھا

اسرار تیرے معدنِ انوار تھے جس میں
مسجد تھی نہ کعبہ، وہ نہاں خانۂ دل تھا

ہر موجِ نفس سینے میں اک قلزمِ خوں ہے
کیا میرے تصوّر میں کچھ افسانۂ دل تھا

آسیؔ نے بجز تیرے جہاں کچھ نہیں دیکھا
وہ عالمِ ہُو گوشۂ ویرانۂ دل تھا

(۱۷)

جو پتھر آ کے سر میں لگا لالہ گوں ہُوا
ہر داغ گُل فروشِ بہارِ جنوں ہُوا

توبہ سے بڑھ کے ذوقِ لبِ بادہ گوں ہُوا
مینائے مے مرے لیے مینائے خوں ہُوا

فرہاد! میری راہِ طلب کی صعوبتیں
ایک ایک سنگ ریزہ یہاں بےستوں ہُوا

افسوس نقشِ سجدہ ترے آستان کا
میں کیوں نہ جبہۂ سرِ گردونِ دوں ہُوا

میں اور زہرِ تلخیٔ تقدیرِ پند گو
اے دوست تو ہی دشمنِ صبر و سکوں ہُوا

رنگِ شفق سے نوکِ مژہ کا مقابلہ
گویا کہ آسمان بھی دریائے خوں ہُوا

بے قیدیاں بری[1] تھیں تجھے لامکاں کی
کیوں زیرِ بارِ منتِ سقف و ستوں ہُوا

ناوک فگن کی چشمِ توجہ کہاں نصیب
سینے میں دل بھی حسرتِ صیدِ زبوں ہُوا

---

[1] پڑی

بے شبہہ پائے بوس ترا فرضِ عین ہے
چرخِ[1] بریں اسی کے لیے سرنگوں ہُوا

وصل ایک حُور کا نہ میسّر ہو یا نصیب
گویا رقیبِ اُلفتِ دنیائے دوں ہُوا

اُس نے جو دل کو پھُونک دیا اِس نے عرش کو
نالا حریفِ طاقتِ سوزِ دروں ہُوا

ممنونِ خاکِ سجدہ ہوں اے وعدہ گاہِ دید
داغِ جبیں، خضر کی طرح رہ نموں ہُوا

خالی ہو آپ سے تو ملے اذنِ خاک بوس
مجھ کو تو خضرِ رہ قدحِ واژگوں ہُوا

لاکھوں ہی آرزوئیں تھیں جو ذبح ہو گئیں
صبحِ شبِ وصال بڑا کشت و خوں ہُوا

میں اور وصفِ چشمِ سخن گو نہ کر سکوں
اللہ! معجزہ بھی ہلاکِ فسوں ہُوا

یوں دل سے گھر کو چھوڑے ہوئے بھاگے جاتے ہو
کیا ظلم تم پر اے مرے صبر و سکوں ہُوا

ذلّت اگر دلیلِ کمالاتِ عشق ہے
آسیؔ سے بڑھ کے کون ذلیل و زبوں ہُوا

---

[1] چرخِ بلند بنتے ہوئے سرنگوں ہوا

(۱۸)

غیرِ موسیٰ کون ہم دم وادیٔ ایمن میں تھا
چوُر وہ بھی نشۂ صہبائے مرد افگن میں تھا

نالہ کش جس کے لیے ہر باغ، ہر گلشن میں تھا
خوب جو دیکھا وہی گل میرے پیراہن میں تھا

جو نہ اُٹھے آسمانوں سے اُٹھا لیں ہم وہ بوجھ
کیا وہ قوت سر میں تھی کیا زور وہ گردن میں تھا

کون ہو منت کشِ تدبیر اے وقتِ شعور
کیا نہیں اب، وہ جو ضامن رزق کا بچپن میں تھا

اس تمنا میں کہ شاید ان کے دل تک راہ ہو
اس عداوت پر بھی میں برسوں دلِ دشمن میں تھا

قابلِ نذرِ تجلی جان و دل سب تھے یہاں
ہوشِ موسیٰ کے سوا کیا وادیٔ ایمن میں تھا

خونِ ناحق گردنوں پر کیوں لیا منصور کا
مدعی قولِ انا الحق کا رگِ گردن میں تھا

ہائے وہ جلوہ وہ اندازِ ہجومِ اہلِ دید
ایک موسیٰ زار گویا دل کے ہر روزن میں تھا

وہ بھی نذرِ سینۂ غم ناکِ بلبل کر دیئے
چند چاکوں کے سوا کیا پھولوں کے دامن میں تھا

محوِ خطِ یار رشکِ حوُر، سوزِ ہجر میں
سبزۂ گل زارِ جنت تھا، مگر گلخن میں تھا

یا رب انصافِ ستم ان کا شبِ غم تھا ضرور
شورِ محشر نالہ ہائے آسماں افگن میں تھا

کس کے پیکانِ دل افزا کا سیا تھا اُس نے زخم
جوشِ آبِ زندگانی چشمۂ سوزن میں تھا

دوست پر کس دوست نے کی ہو گی ناوک افگنی
ہو نہ ہو اے فتنہ گر دشمن تری چتون میں تھا

سچ، جو یہ شہرت نہ تھی آسیؔ کہ مرنا ہے وصال
کیوں قرار آیا تجھے مدفن میں، کیا مدفن میں تھا

لے لے لیا شے تیرے

۱۹

بڑھ کے شہ رگ سے گلے ملنے کو وہ آمادہ تھا
ہائے اے وہمِ غلط اب[1] تک میں دُور افتادہ تھا

وہ دلِ سوزاں کے ٹکڑے آنسوؤں میں ہائے ہائے
صاف پلکوں پر گمانِ کاہِ آتش دادہ تھا

حالِ دل کیا اُس سے کہنا دل ہی میں جس کا ہو گھر
گو نہ سودائی ہو عاشق پھر بھی کتنا سادہ تھا

جائے مردم آنکھیں تھیں اور آپ تھے[1] خلوت پسند
سینے میں کیا بحث تھی میں عاشقِ دل دادہ تھا

پائمالِ حسرت و اندوہ دیکھا عمر بھر
سینہ چاکی میں ترا عاشق بھی رشکِ جادہ تھا

توڑنا مینائے مے کا دل شکن کیوں کر نہ ہو
محتسب کو کیا ہوا تھا میں تو مستِ بادہ تھا

جو نہ سننے میں کبھی آئی میں کہتا تھا وہ بات
پھر عبث رشکِ زبانِ سوسنِ آزادہ تھا

دل کہاں تھا جذبِ دل پر میں جو کرتا اعتماد
میں تو اک دل سوختہ، دل باختہ، دل دادہ تھا

---

[1] کتنا ۔ ہیں

زاہد و واعظ جو آتے سب تکلف بر طرف
خوب فرشِ بوریائے نقشِ موجِ بادہ تھا

تلخ کامِ ہجر کا کیا پوچھتے ہو حال اب
رات شاید زہر کھانے کے لیے آمادہ تھا

سجدۂ جوشِ ندامت بھی کرامت ہو گیا
موجِ آبِ گریۂ غم پر، رواں سجادہ تھا

دل ترا صد پارہ کیوں اے شانۂ زلفِ صنم
میرے صدموں کا بھلا کیا، میں تو دُور افتادہ تھا

کیا سمجھ کر ہاتھ دوڑاتی تھی ہم مستوں کی خاک
دَورِ دامانِ قبا تھا وہ کہ دَورِ بادہ تھا

رہگزارِ صد امید و یاس، تھا ہر چاکِ دل
داغِ غم وہ دل میں تھا یا نقشِ پائے جادہ تھا

سینۂ خالی، حُبابِ بحر، دونوں ایک ہیں
دلے کے دل بہرِ فنا عاشق نہ کب آمادہ تھا

یہ کیا تھا حالِ گُل اُس گُل کے سوزِ رشک نے
شبنمِ گلبُن نہ تھی اشکِ بخاک اُفتادہ تھا

کوئی مصرع لا سکے مصرع پر اُس کے کیا مجال
سرو کے مانند آسیؔ شاعرِ آزادہ تھا

لہ دے کے دل عاشق نہ کب بہرِ فنا آمادہ تھا

(۲۰)

صبح تک آج دھواں کوچۂ بے پیر میں تھا ‏ ‏ ‏ آگ کا جزو مگر نالۂ شب گیر میں تھا

حسرتِ عاشق و امیدِ عدو بسمل ہوں ‏ ‏ ‏ کاٹ اتنا بھی نہ اُن[1] کے دمِ شمشیر میں تھا

دیکھنا جانبِ گردوں وہ ترے نالاں کا ‏ ‏ ‏ ہائے کیا جوشِ اثر حسرتِ تاثیر میں تھا

غش ہیں اس طرح گریں حضرتِ موسیٰ سے نبی ‏ ‏ ‏ جلوۂ طُور ضرور آپ کی تصویر میں تھا

دھوکے میں ابروئے قاتل کے جھکا دی گردن ‏ ‏ ‏ کعبے میں بھی وہی تھا جو خمِ شمشیر میں تھا

نالۂ عرش فگن کا بھی مزا اب چکھّے ‏ ‏ ‏ کر چکا بس جو مزاجِ فلکِ پیر میں تھا

ہاں پھر اے واعظِ مشفق مری تقصیر معاف ‏ ‏ ‏ دھیان دَورِ مئے گل رنگ و مزامیر میں تھا

اے لحد ہائے وہ بے تابیٔ شب ہائے فراق ‏ ‏ ‏ آج آرام سے سونا مری تقدیر میں تھا

بے قراری نے کئے تھے جگر و دل یک جا ‏ ‏ ‏ بہرہ ور دونوں ہوں کب حوصلۂ تیر میں تھا

سجنِ مومن کے یہ معنی تھے کہ تا قیدِ حیات ‏ ‏ ‏ پاؤں زنجیر میں دل زلفِ گرہ گیر میں تھا

آرزوئے لبِ سوفار گرہ تھی شاید ‏ ‏ ‏ ایک غنچہ چمنِ حسرتِ نخچیر میں تھا

کیا خبر حال کی اپنے تجھے دیتا شبِ ہجر ‏ ‏ ‏ اے صنم! حال بھی کچھ عاشقِ دل گیر میں تھا

لالہ زارِ دلِ خوں گشتہ مرے عہد میں ہے ‏ ‏ ‏ نجد کا بن جو کبھی قیس کی جاگیر میں تھا

قید میں جب نہ ہوئی دید تو ہو وعدہ خلاف ‏ ‏ ‏ شورِ ہنگامۂ محشر مری زنجیر میں تھا

آئینہ خانے میں تھا عاشقِ لاغر تیرا ‏ ‏ ‏ یا کوئی تارِ نگہ دیدۂ تصویر میں تھا

دے فشارِ لحدی یادِ ہم آغوشیِ یار ‏ ‏ ‏ خوابِ آرام نہ اب بھی مری تقدیر میں تھا

تا دمِ مرگ نہ آسیؔ کو میسر ہو وصال
کیا یہی طالعِ بدبختِ جواں میر میں تھا

---

[1] اُن کی

(۲۱)

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہُوا
اور اس سے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہُوا

شانِ کرم تھی یہ بھی اگر وہ جدا ہُوا
کیا محنتِ طلب میں نہ حاصل مزا ہُوا

میں اور کوئے عشق، مرے اور یہ نصیب
ذوقِ فنا خضر کی طرح رہنما ہُوا

پہچانتا وہ اب نہیں دشمن کو دوست سے
کس قید سے اسیرِ محبّت رہا ہُوا

شایانِ درگذر ہے اگر اضطرار میں
جرمِ درازِ دستیِ ذوقِ دعا ہُوا

کیا کیا نہ اس نے پورے کئے مدعائے دل
لیکن پسند اُسے دلِ بے مدعا ہُوا

اس کا پتا کسی سے نہ پوچھو بڑھے چلو
فتنہ کسی گلی میں تو ہو گا اٹھا ہُوا

گُل رویوں کے خیال نے گلشن بنا دیا
سینہ کبھی مدینہ کبھی کربلا ہوا

پیچیدہ تھی جو سر میں ہوائے رضائے دوست
آسیؔ مریدِ سلسلۂ مرتضےٰؑ ہُوا

(۲۲)

کسی میں جو کوئی فنا ہو گیا
نہ کچھ پوچھ آسی وہ کیا ہو گیا[1]

پلائی ہے ساقی نے کیسی شراب
کہ جو رند تھا پارسا ہو گیا

کسی کے نکالے نکلتا نہیں
عدو بھی مرا مدّعا ہو گیا

دلِ پُر ہوس مرغِ نکہت کی طرح
اسیرِ کمندِ ہوا ہو گیا

جب اس کوچے میں جا کے رہتا تھا[2] میں
جو چاہا کیا، جو کہا ہو گیا

اُڑایا ہے کس گُل سے رنگِ چمن!
کہ ہر نخلِ گُل گوں قبا ہو گیا

انا الحق بھلا قولِ منصور تھا
بتاؤ تو بندہ خدا ہو گیا

---

[1] نہ پوچھ اس کو [2] میں تھا

(۲۳)

پوچھتے ہو کہ سرِ وحدت کیا — ما سوا کی بھلا حقیقت کیا
ہم نہیں جانتے قیامت کیا — آج اگر تم ملو قباحت کیا
واعظو! اُس کو دیکھ لو پہلے — پھر کہو حور کیا ہے جنت کیا
نہ گرے اُس نگاہ سے کوئی — اور افتاد کیا، مصیبت کیا
نقدِ ہستی نثارِ یار کرے — یہ نہیں ہے تو پھر محبت کیا
عاشقی میں ہے محویت درکار — راحتِ وصل و رنجِ فرقت کیا
جن میں چرچا نہ کچھ تمہارا ہو — ایسے احباب، ایسی صحبت کیا
اُس سے مل جو ہمیشہ ساتھ رہے — بے وفاؤں سے لطفِ صحبت کیا
باغِ رضواں بھی باغ ہے آخر — سیرِ گل کے لیے ریاضت کیا
ملنے والوں سے راہ پیدا کر — اس کے ملنے کی اور صورت کیا
بس تمہاری طرف سے جو کچھ ہو — میری سعی اور میری ہمت کیا
اُس کے حق دار ہم شرابی تھے — اہلِ تقوٰے و ابرِ رحمت کیا
جاتے ہو جاؤ ہم بھی رخصت ہیں — ہجر میں زندگی کی مدت کیا
گوشہ گیری حدیثِ نفس کے ساتھ — دل ہی مجمع میں ہے تو عزلت کیا
کوئی تیرے سوا کہیں ہے بھی — بدگمانی کی مجھ سے علت کیا
یوں ملوں تم سے میں کہ میں بھی نہ ہوں — دوسرا جب ہوا تو خلوت کیا
اور ہمت بلند کر اے شیخ — طمع و خوف کی عبادت کیا

آسیِؔ مست کا کلام سنو
وعظ کیا، پند کیا، نصیحت کیا

(۲۴)

میں جو الزامِ محبت میں گرفتار ہوا
قیدیٔ سلسلۂ حیدرِ کرّار ہوا

سوئے جنت مجھے اس کوچے سے کیوں لے جاتے
جان دی آپ پر، اے جان گنہ گار ہوا

آپ بھیجا مجھے اور آپ بلایا اُس نے
بارِ احساں سے کسی کے نہ گراں بار ہوا

جز فنا راہِ رہائی نہ اُسے ہاتھ آئی
جو ترے دامِ محبت میں گرفتار ہوا

میں نہ کیوں محشرِ دیدار کو مقتل سمجھوں
کشتۂ تیغِ ادائے نگہِ یار ہوا

ہمت اُس کی ہے، دل اُس کا ہے، جگر اُس کا ہے
جان کو بیچ کے تیرا جو خریدار ہوا

بک گئے روزِ ازل پیرِ خرابات کے ہاتھ
ہم ہوئے تم ہوئے یا آسیِؔ مے خوار ہوا

(۲۵)

بدرقہ راہِ طلب میں نہیں ہمت کے سوا
راہبر کوئی نہیں جوشِ محبت کے سوا

اور کیا چاہتی ہے آرزوئے دل اُن سے
کچھ نہیں حسن کی سرکار میں حسرت کے سوا

نظر و ناظر و منظور نہ جب ایک ہوئے
کیا ملا روزِ قیامت میں ندامت کے سوا

کچھ خبر کوچۂ جاناں کی بھی ہے اے واعظ
عشق بازوں کی ہے جنت تری جنت کے سوا

تابعِ خواہشِ محبوب ہو خواہش جس کی
رنج پاس اُس کے نہ آئے کبھی راحت کے سوا

حسنِ صورت کے لیے خوبئ سیرت ہے ضرور
گل وہی جس میں کہ خوشبو بھی ہو رنگت کے سوا

پوچھتے ہو شہِ جیلاں کے فضائل آسیؔ
ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا

فرد

پرتوِ عارض ہے دریا نور کا
زُلف صحرا ہے سکندر پور کا

دیگر

دل جو اُمڈا پھوٹ نکلے ہر بُنِ مو سے سرشک
پیکرِ خاکی میں عالم تھا سبوئے خام کا
یار ہے دل تنگ یا دل چاک یا پژمُردہ دل
صورتِ گل منہ نہ دیکھا عمر بھر آرام کا

فرد

قصرِ دل میں جب کسی دن آپ کا آنا ہوا
یہ ہوئی رفعت کہ بامِ عرش تہ خانا ہوا

"ردیف ب"

اہلِ ہمت کا کبھی بے جا نہ دیکھا اضطراب
عینِ ہستی ہے برائے موجِ دریا اضطراب

ناصح اندھا ہے جو سمجھا ہے ہمارا اضطراب
صورتِ امواج میں کرتا ہے دریا اضطراب

مر گئے پر جو فنا ہو جائے وہ کیا اضطراب
سیکھ جائے آپ کے کُشتے سے پارا اضطراب

کیا ہماری خاک سمجھا یا کہ کوچہ آپ کا
خاک اُڑانے میں جو کرتا ہے بگولا اضطراب

تیرے رو کے ہم کہیں رکتے ہیں واعظ تو سہی
جب کرے بہرِ طوافِ یار کعبا اضطراب

بعدِ مُردن ہو تو ہو لے پند گو یہ تجربہ
عشق بازوں کا سکوں اچھا کہ اچھا اضطراب

کیا ہمیں چلنا نہیں ہے جانبِ مُلکِ عدم
دم تو لے لے اے شرارِ جستہ اتنا اضطراب

حشر کا میدان اور اس میں دلِ دیدار جو
وہ سراسر فتنہ یارب یہ سراپا اضطراب

طائرِ جاں کو نکلنے دے قفس سے صبر کر
دیکھنا ہو جائے گا اک روز عنقا اضطراب

ایسی حالت یا الٰہی اور میں مرتا نہیں
جاں فزا ہے دردِ دل یا روح افزا اضطراب

مثلِ سیماب آ گیا آخر پسِ کشتن قرار
آرزوئے قتل ہی میں تھا وہ سارا اضطراب

سانس لینا مشکل اور اُس پر تڑپنا لوٹنا
ہائے یہ بے طاقتی اور اس طرح کا اضطراب

گریۂ وقتِ دعا بے تابیٔ حسنِ قبول
جیسے پانی دیکھ کر کرتا ہے پیاسا اضطراب

واہ وا حُسنِ مذاقِ تلخ کامِ عشق واہ
لذت افزا زاد نالی راحت افزا اضطراب

جوشِ نازِ جلوہ، برقِ خرمنِ صبر و قرار
ذرّے کو ہوتا ہے پیشِ مہر کیا کیا اضطراب

اضطرابِ کلفتِ ناکامیٔ دل آرزو
موجۂ طوفانِ زہرآبِ تمنا اضطراب

کیا اُمیدِ زندگی اب آسیِؔ بے تاب کی
جاں گسل آزارِ الفت، روح فرسا اضطراب

"ردیف ت"

رات ہے رات تو بس مردِ خوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی یا ذوقِ مناجات کی رات

ہم گدایانِ درِ پیرِ خرابات کی رات
ہے شبِ قدر سے دعوئ مساوات کی رات

گریۂ غم ہے کہ ساون کی جھڑی تا دمِ صبح
کوئی موسم ہو یہاں رہتی ہے برسات کی رات

رات دن ہوتی ہے اللہ رے تیری قدرت
عید کا روز ہے یاروں کی[1] ملاقات کی رات

شبِ دیجور ہے یا ظلمتِ ایامِ فراق
کیا لکھی تھی مری تقدیر میں دن رات کی رات

سخت دشوار تھی معشوق سے عاشق کی شناخت
وصل کی رات نہ تھی، تھی وہ طلسمات کی رات

رات خاکِ کفِ پا اُس کے سگِ در کی ملی
اور کیا اس سے سوا ہو گی مباہات کی رات

بُعد تھا قرب، جدائی تھی اگر عین وصال
یاد ہے اے کششِ دل وہ کرامات کی رات

---

[1] کے

وقت بے وقت کے جھگڑے ہیں وجود اور عدم
دن ستاروں کی فنا، نفی ہے ذرات کی رات

کچھ ہمیں سمجھیں گے یا روزِ قیامت والے
جس طرح کٹتی ہے اُمیدِ ملاقات کی رات

پھر نہ سجدے سے اُٹھے کر کے شبِ وصل کی قدر
کہ شبِ قدر تھی طاعات و عبادات کی رات

صبح[1] ہوتی ہے کوئی دم میں وہ آئے بھی تو کیا
نہ کسی کام کی رات اب نہ کسی بات کی رات

تُندیِ بادۂ جلوہ میں ہے[2] روزِ محشر
ہم گدایانِ درِ پیرِ خرابات کی رات

پھر وہی طرفِ چمن ہو، وہی صحبت، وہی دور
پھر وہی ہم ہوں، وہی تم، وہی برسات کی رات

رات ساتھ آئے گی، آنے دو، جو وہ دن کو بھی آئیں
زلف کی زلف ہے وہ زلفِ سیہ رات کی رات

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
ہے شبِ گور بھی اُس گل کی[3] ملاقات کی رات

---

[1] ایک نسخہ میں یہ شعر بھی ہے [2] قیامت نکلی [3] کے

(۲۸)

وفا دشمن ہو تم یا ہو جفا دوست
بہر صورت مجھے رہنا رضا دوست

کوئی دشمن ہو آسیؔ یا مرا دوست
میں سب کا دوست کیا دشمن ہو کیا دوست

جگر دل دونوں زخمی مہ لقا دوست
نہیں کھلتا کہ وہ دشمن ہے یا دوست

مرا سینہ حریفِ طورِ سینا
مرا دل جلوۂ برقِ فنا دوست

ترقی و تنزّل کی نہ پوچھو
میں دشمن ہو گیا دشمن ہوا دوست

لباسِ اُمتِ عیسیٰ پہن کر
نہ پھر کہنا کہ ہیں آلِ عبا دوست

مجھے نیرنگِ دل نے مار ڈالا
یہ دشمن کا ہے دشمن دوست کا دوست

خدائی چاہتی ہے ہم خدا ہوں
کوئی ہو گا نہ ہو گا جو بقا دوست

فریبِ عالمِ صورت سے بچنا
نہیں کوئی کسی کا جُز خدا دوست

نشانِ ہستیِ عاشق نہ رکھا
مگر دشمن ہے دشمن سے سوا دوست

فقیروں کا بنا لو بھیس آسیؔ
وہ شاہنشاہِ خوباں ہے گدا دوست

دعا میں رات آسیؔ کو بھی پایا
نہیں کوئی، نہ ہو جو مُدّعا دوست

"ردیف د"

سر میں سودا ہے تو سودائے محمد ارشدؒ[1]
دل جو شیدا ہے تو شیدائے محمد ارشدؒ

کچھ نہ پوچھو مجھے کس دشت میں کس صحرا میں
لیے پھرتی ہے تمنائے محمد ارشدؒ

سیرِ اقطارِ حقیقت کے لیے سالک کو
زادِ رہ نقدِ تولاّئے محمد ارشدؒ

ناخنِ پائے مبارک سے سرِ اقدس تک
جلوۂ حق ہے سراپائے محمد ارشدؒ

ماہ و خورشید و کواکب کو سمجھتے کیا ہو
ہیں یہ سب فیضِ تجلاّئے محمد ارشدؒ

دل کو کر دیتی ہے مرآتِ جمالِ ازلی
نگہِ لطفِ دل آرائے محمد ارشدؒ

مشعلِ راہِ ہدایت ہے اگر ہاتھ آجائے
ذرۂ خاکِ کفِ پائے محمد ارشدؒ

ہائے رے ہائے وہ الطاف و عنایات کی رات
اے میں قربان کرم ہائے محمد ارشدؒ

آنکھیں اندھی نہ تمہاری ہوں تو اے شمس و قمر
دیکھو نورِ رخِ زیبائے محمد ارشدؒ

کھینچی ہے عالمِ بالا میں بھی طوبیٰ نے کہیں
صورتِ قامتِ رعنائے محمد ارشدؒ

دوست کا دوست بھی ہے آئینہ دارِ رخِ دوست
عارفِ حق ہے شناسائے محمد ارشدؒ

کر دیا دولتِ کونین سے آسی کو غنی
واہ رے گنجِ تولاّئے محمد ارشدؒ

---

[1] ملاحظہ ہو "معروضات"۔ (فاروقی)

۳۰

وہاں پہونچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

شب[1] وصال بیانِ غمِ جدائی کیا
فضول ہے گلۂ زخم التیام کے بعد

وہاں بھی وعدۂ دیدار اس طرح ٹالا
کہ خاص لوگ طلب ہوں گے بارِ عام کے بعد

گناہگار کی سُن لو تو صاف یہ ہے
کہ لطفِ رحم وکرم کیا پھر انتقام کے بعد

طلب تمام ہو مطلوب کی اگر حد ہو
لگا ہوا ہے یہاں کوچ ہر مقام کے بعد

وہ خط وہ چہرہ وہ زلفِ سیاہ تو دیکھو
کہ شام صبح کے بعد آئی صبح شام کے بعد

پیامبر کو روانہ کیا تو رشک آیا
نہ ہم کلام ہو اُس سے مرے کلام کے بعد

ابھی تو دیکھتے ہیں ظرف بادہ خواروں کا
سبُو و خُم کی بھی ٹھہرے گی دورِ جام کے بعد

الٰہی آسیِؔ بے تاب کس سے چھُوٹا ہے
کہ خط میں روزِ قیامت لکھا ہے نام کے بعد

---

[1] شب وصال بیانِ غمِ فراق عبث

(۳۱)

کہاں گلشن کہاں روئے محمدؐ
کہاں سُنبل کہاں موئے محمدؐ

ہے عالم آہن و آہن رُبا کا
کھنچا جاتا ہے دل سوئے محمدؐ

نہ چھانی مُشتِ خاک اپنی کسی نے
ہے دل ہی میں رہِ کوئے محمدؐ

ہے کیا رحم و کرم بندوں پر اپنے[1]
خدا سے ملتی ہے خوئے محمدؐ

دلِ صد چاک ہیں مانندِ شانہ
رچی ہے بوئے گیسوئے محمدؐ

دمِ جاں بخش اعجازِ مسیحا
نسیمِ گلشنِ کوئے محمدؐ

حیاتِ جاوداں پاتا ہے آسیؔ
قتیلِ[2] تیغِ ابروئے محمدؐ

---

[1] اُن کا [2] شہید

(۳۲)

دلِ شیدا ہے بیمارِ محمدؐ — اسیرِ زلفِ خم دارِ محمدؐ
جو داغِ دل ہے چشمِ آرزو ہے — غضب ہے شوقِ دیدارِ محمدؐ
عزیزِ مصر دل کہتے ہیں اِس کو — ہے یوسف بھی خریدارِ محمدؐ
اگر مُردہ سُنے زندہ ہو دم میں — دمِ عیسٰی ہے گفتارِ محمدؐ
بچھا جاتا ہے دل قدموں کے نیچے — یہ ہے اندازِ رفتارِ محمدؐ
سدا جس کو بہارِ بے خزاں ہے — وہ ہیں گل ہائے رخسارِ محمدؐ
دمِ نزع آئے جان آنکھوں میں جس دم — خدا دکھلائے دیدارِ محمدؐ
گھُلے کب تک تپِ فرقت سے یارب — علیلِ چشمِ بیمارِ محمدؐ
مدینہ ہو مرا مدفن الٰہی — بسوں میں زیرِ دیوارِ محمدؐ
خریدارانِ یوسف کا ہے دل سرد — یہ ہے گرمیِ بازارِ محمدؐ
محمدؐ ہیں خدا کے عاشقِ زار — خدا ہے عاشقِ زارِ محمدؐ
پھر آئے دم میں عرشِ کبریا سے — یہ ہے اعجازِ رفتارِ محمدؐ

نہیں اپنے گناہوں کا مجھے غم
میں آسیؔ ہوں گنہگارِ محمدؐ

"ردیف ر"

وہ کون حسرت تھی دل کےلے اندر کہ وقفِ صد پیچ و تاب ہو کر
جب آنکھوں تک جوش کھا کے آئی ٹپک پڑی خونِ ناب ہو کر

ہنوز پردے میں تم ہو لیکن ہزاروں فتنے اُٹھاٹے دیئے ہیں
مگر قیامت کرو گے برپا جو نکلو گے بے حجاب ہو کر

شگوفہ تھا دل کی بے کلی کا لطیفہ تھا بس وہ عاشقی کا
اِدھر سے نکلا سوال ہو کر اُدھر سے آیا جواب ہو کر

نعیم کیسی جحیم کیسی کرشمے سارے یہ حُسن کے ہیں
کسی کو لُوٹا ثواب ہو کر کسی کو مارا عذاب ہو کر

وہ ہیں سوارِ سمندِ خوبی ہلالِ شوّال کی یہ شوخی
گلے لگا اُن کے ہو کے کنٹھا قدم لئے ہیں رکاب ہو کر

بلندی اُس کی اُسی کی پستی ہر ایک شے میں اُسی کی ہستی
عروج اُسی کا رسول ہو کر نزول اُسی کا کتاب ہو کر

وہ حُسن جس پر نظر نہ ٹھہرے تماشےسے اُس کے دکھا رہی ہے
کہیں صباحت نقاب ہو کر، کہیں ملاحت حجاب ہو کر

خبر جو محشر میں بھیڑ کی ہے وہ حسرتوں کا ہجوم ہو گا
وہ داغ ہو گا کسی کے دل کا جو چمکے گا آفتاب ہو کر

لے میں ایسی جو سے اُٹھا چکے ہو سے بہار اُس کی

شناخت اُس کی ہو سہل کیوں کر کہ جب نہ تب بھیس اک نیا ہے
وہ دن کو خورشید ہو کے نکلے تو رات کو ماہتاب ہو کر

میں دل سے اس شیخ کا ہوں قائل جو مے کدے میں پڑھے تہجد
لگائے مسجد میں نعرے ہو حق کے محوِ دورِ شراب ہو کر

فراق میں اس قدر نہ روؤ[1] ابھی تمہیں کچھ خبر نہیں ہے
بڑھے گی کچھ اور بے قراری وصال میں کامیاب ہو کر

نہ کر تو اس کی مذمت اتنی بہشت کی چیز ہے یہ واعظ
یہ بلکہ ہے عینِ بحرِ رحمت اگرچہ آیا شراب ہو کر

وہ[2] جسم تھا یا کوئی گلِ تر، شمیم جس کی وہ روح پرور
جدھر سے گزرے بسا وہ رستا بہا پسینہ گلاب ہو کر

بچھا کے دامِ فریبِ پیری کسی کو بے ذوق کر دیا ہے
کسی کو بلبل بنا لیا ہے بہارِ باغِ شباب ہو کر

نگاہ اُن کی نہیں ہے برچھی کہ غمزہ اُن کا نہیں ہے خنجر
کریں گے اقرارِ خونِ آسیؔ کبھی تو وہ لاجواب ہو کر

جنابِ ناسخؔ کی یہ ہدایت ہے یاد رکھنا تم اس کو آسیؔ
غزل میں ایسے ہوں شعر جن میں کمی نہ ہو انتخاب ہو کر

---

[1] تڑپو [2] بدن وہ تھا یا کوئی گلِ تر پھر اس کی خوشبو وہ رُوح پرور [3] عاشق

(۳۴)

نہ میرے دل، نہ جگر پر، نہ دیدۂ تر پر
کرم کرے وہ نشانِ قدم تو پتھر پر
تمہارے حسن کی تصویر کوئی کیا کھینچے
نظر ٹھہرتی نہیں عارضِ منوّر پر
کسی نے لی رہِ کعبہ کوئی گیا سوئے دَیر
پڑے رہے ترے بندے مگر ترے در پر
گناہگار ہوں میں واعظو تمہیں کیا فکر
مرا معاملہ چھوڑو شفیعِ محشرؐ پر
اُن ابروؤں سے کہو کشتنی میں جان بھی ہے
اسی کے واسطے خنجر کھنچا ہے خنجر پر
پلا دے آج کہ مرتے ہیں رند اے ساقی
ضرور کیا کہ یہ جلسہ ہو حوضِ کوثر پر
صلاحیت بھی تو پیدا کر اے دلِ مضطر
پڑا ہے نقشِ کفِ پائے یار پتھر پر
وفورِ جوشِ ضیا اور اُن کے دانتوں کا
حبابِ گنبدِ گردوں ہے آبِ گوہر پر
اخیر وقت ہے آسیؔ چلو مدینے کو
نثار ہو کے مرو تربتِ پیمبرؐ پر

---

[1] آب

۳۵

وہی جو مستویِ عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفاؐ ہو کر

کیا جو عشق نے کاہیدہ مثلِ کاہ مجھے
کشش کسی کی اڑا لے گئی ہوَا ہو کر

قرار جز دلِ عاشق کجا حسیناں را
وہ آخر آئے مرے دل میں جا بجا ہو کر

نہ پوچھ تندی و تیزی مئے محبت کی
جسے یہ نشہ چڑھا رہ گیا فنا ہو کر

مِرا سفینہ تلاطم میں بحرِ عشق کے ہے
مزا تو جب ہے خدا آئے ناخدا ہو کر

بجز تمہارے کسی کا وجود ہو یہ محال
مگر تمہیں نظر آتے ہو ماسوا ہو کر

نثار کیوں نہ کریں جان اُس پر اے آسیؔ
فلک سے جا کے لگے جس کی خاکِ پا ہو کر

"ردیف ز"

کیا تجھ سے طلب کرے یہ جاں سوز
بس ایک نگاہِ دو جہاں سوز

شعلہ بھی ہے کیا شبیہ مجھ سے
ظاہر، باطن، نہاں، عیاں سوز

وہ سوزِ تپِ فراق پوچھیں
جانا کہ یہ ذکر ہے زباں سوز

ساقی کی نگاہِ مست تھی آہ[1]
یا بادۂ تند استخواں سوز

کچھ سوزِ دروں کی انتہا ہے
اک آہِ ضعیف مغزِ جاں سوز

ہم اور خموشش اے قیامت
گرمی جلوے کی ہے فغاں سوز

کس دشت میں عشق نے تھکایا
ہر ریگِ رواں ہے کارواں سوز

ہر داغِ جگر ہے صورتِ گل
ہر آتشِ گل ہے گلستاں سوز

بلبل ہے کہ آسمانِ اندوہ
نالہ ہے کہ برقِ آشیاں سوز

سرجوشِ شرابِ ناب غم تھا
یا آتشِ تندِ خانماں سوز

خود شعلہ ہے سازِ سوزِ شعلہ
کیوں جوشِ فغاں نہ ہو فغاں سوز

بے پردہ ہے عرش کا نظارہ
ہر شعلۂ دل ہے آسماں سوز

اُس خلوتِ راز کے طلسمات
جو راز کھلا وہ راز داں سوز

وہ جانِ نزارِ آسیِؔ زار
وہ تاب گداز غم تواں سوز

---

[1] وہ

۴۷

گل باغ میں زر ریز ہیں شبنم ہے گہر ریز
اک ہم ہیں کہ دن رات رہے لختِ جگر ریز

جُز اِس کے کہ آنکھیں ہوں کبھی لختِ جگر ریز
دیکھا ہی نہیں نخلِ محبت کو ثمر ریز

بس بس مرے آگے نہ کر اے مرغِ سحر ریز
تیرا بھی کبھی نالہ ہوا کوئی شرر ریز

اُس رشکِ چمن تُرک کے[1] ہاتھوں کی کرامت
بلبل کی طرح کرتے ہیں گل ہائے سپر ریز

کیا جانیے سینے میں کہاں آگ لگی ہے
آہیں ہیں دھواں دھار تو نالے ہیں شرر ریز

کیوں عاشقِ گریاں سے ملاتے نہیں آنکھیں
دیکھو یہ وہ آنکھیں ہیں کہ رہتی ہیں گہر ریز

شیرینیِ لعلِ لبِ جاناں سے ہے ظاہر
طوطیِ خطِ سبزِ حسیناں ہے شکر ریز

موقع ہے یہی تجھ سے اُڑا کیوں نہیں جاتا
کیا ہجر ہے اے طائرِ جاں موسمِ پر ریز

یہ شامِ شبِ وصل ہے دھوکے میں نہ آنا
آسیؔ رُخِ محبوب ہے خود نورِ سحر ریز

---

[1] کی صحبت کی یہ تاثیر

(۲۸)

حسن کی کم نہ ہوئی گرمیٔ بازار ہنوز
نقدِ جاں تک لیے پھرتے ہیں خریدار ہنوز

طائرِ جاں قفسِ تن سے تو چھوٹا لیکن
دامِ گیسو میں کسی کے ہے گرفتار ہنوز

ساتھ چھوڑا سفرِ ملکِ عدم میں سب نے
ساتھ[1] لپٹی ہی رہی حسرتِ دیدار ہنوز

اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو
چشمِ بیمار کے بیمار ہیں بیمار ہنوز

ہم بھی تھے روزِ ازل صحبتِ بزمِ الست
بھولتی ہی نہیں وہ لذتِ گفتار ہنوز

کیا خراباتیوں کو حضرت آسیؔ نہ ملے
کہ سلامت ہے وہی جُبّہ و دستار ہنوز

---

[1] لپٹی جاتی ہے مگر

"ردیف ف"

کیا میری کائنات کہاں جُبّہ[1] شریف
سر پر ہو میرے نور فشاں جُبّہٗ شریف

حیرت ہے اُس کے ظاہر و باطن کے حال پر
پنہاں تو نورِ حق ہے عیاں جُبّہٗ شریف

گزرا جدھر سے نورِ فشاں ہو کے کر گیا
رستے کو رشکِ کاہکشاں جُبّہٗ شریف

عرشِ بریں کو کیوں نہ ہو رشک اُس زمین پر
رونق فزا ہو آ کے جہاں جُبّہٗ شریف

ہاں منکرو جو تم کو نہ سوجھے عجب نہیں
پردے میں نور کے ہے عیاں جُبّہٗ شریف

جنت دھری ہے اہلِ زیارت کے واسطے
ہے خضرِ راہِ باغِ جناں جُبّہٗ شریف

اے اہلِ ذوق لوٹ لو دیدار کے مزے
سوچو تو دل میں پھر یہ کہاں جُبّہٗ شریف

وہ کیا ہے جس میں بوئے نبیؐ ہو بسی ہوئی
مجھ سے جو پوچھو کہہ دوں کہاں جُبّہٗ شریف

اس وقت زندگی مری آسی اسی میں ہے
میں اور میری روحِ رواں جُبّہٗ شریف

---

[1] جلوہ

(۴۰)

ایک عالم ہے کہ مقتل میں ہے قاتل کی طرف
دھار خنجر کی فقط عاشقِ بے دل کی طرف

اس سے مانگا بھی اگر کچھ تو اسی کو مانگا
دیکھنا حوصلہ و ہمتِ سائل کی طرف

زور ہے جوشِ طلب کا کہ اسی کی ہے کشش
خود بخود پاؤں اٹھے جاتے ہیں منزل کی طرف

نسبتِ شرک بجز تہمتِ بے جا کیا ہے
دل ہے جب اس کی طرف رخ ہے شمائل کی طرف

مستیٔ نعرۂ ہُو حق بھی کہیں وعظ میں ہے
چھوڑ کر حق کو عبث جاتے ہیں باطل کی طرف

طعن و تشنیع سے نقصان نہیں ظاہر[1] کا
طعنِ ناقص کبھی عائد نہ ہو کامل کی طرف

ترکِ دنیا تو ہے دنیا طلبی سے آساں
چھوڑ کر سہل عبث جاتے ہیں مشکل کی طرف

میں خدنگِ نگہِ مست کے صدقے ساقی
ایک تیر اور بھی میرے دلِ بسمل کی طرف

ہائے تم نالۂ پُر درد ہمارا نہ سنو
گوشِ گل ہے[2] ہمہ تن شورِ عنادل کی طرف

کون اس گھاٹ سے اترا کہ جنابِ آسی
بوسہ لینے کو جھکے ہیں لبِ ساحل کی طرف

---

[1] عارف [2] ہیں

"ردیف ک"

لب بلب ہے آج تجھ سے تیرے مستانے کی خاک
خوب پہچان اے بُتِ مے نوش پیمانے کی خاک

بے سبب گڑنا نہیں اس کا یہاں صہبا کشو
قالبِ خم میں مگر ڈالی تھی مے خانے کی خاک

حشر و نشرِ حسرت و اندوہ دیکھا رات دن
کیا قیامت خیز نکلی تیرے دیوانے کی خاک

اک ذرا دامن اٹھائیے اے نگارِ شمع رُو
شعلہ زارِ سوزِ غم ہے تیرے دیوانے کی خاک

وہ تو کیوں آنے لگے پھر کچھ سبب اے بے خودی
گردۂ باغِ ارم ہے میرے ویرانے کی خاک

گردشِ صد جامِ وحشت ایک اِک ذرّے میں ہے
بزمِ صہبائے جنوں ہے تیرے دیوانے کی خاک

اے کہ گوئی تابشِ ہر ذرّہ از تابِ خوراست
مطلعِ نورِ خدا ہے ہر صنم خانے کی خاک

ہائے ان قسمت زدوں کے سینہ و قلب و جگر
جن کے قالب میں پڑی ہو میرے غم خانے کی خاک

ذوقِ اہلِ سُکر و زہدِ خشک اے دل ہائے ہائے
صرفِ جامِ بادہ کر سبحہ کے ہر دانے کی خاک

تیرے ہی جلوے ہیں جب توڑا بُتِ پندار کو
لاکھ کعبے کا ہیولیٰ ایک بت خانے کی خاک

ایک اِک ذرّہ ہے فردِ دفترِ صد سوزِ غم
داستاں سنج دلِ عاشق ہے پروانے کی خاک

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے او بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

بوالہوس تجھ کو اگر تھی گنجِ مخفی کی تلاش
چھاننا تھی مثلِ آسیؔ دل کے ویرانے کی خاک

(۴۲)

سُن لے میری اے خدائے غوثِ پاکؒ
تا بہ کے تڑپوں برائے غوثِ پاکؒ
دل ہے اے آسیؔ فدائے غوثِ پاکؒ
جانِ شیدا مبتلائے غوثِ پاکؒ
جانئے اس کو ولی اللہ کا
جس کے دل میں ہو ولائے غوثِ پاکؒ
گردنیں ہوں اولیاء کی زیرِ پا
کون ایسا ہے سوائے غوثِ پاکؒ
نورِ چشمِ مرتضیٰؓ و مصطفےٰؐ
نورِ حسنِ دل کشائے غوثِ پاکؒ
دیکھئے شانِ عُلوِّ مرتبت[1]
عرش ہے دولت سرائے غوثِ پاکؒ
کیوں رہے یہ کعبۂ دل بے غلاف
ہاتھ اگر آئے ردائے غوثِ پاکؒ
زیرِ[2] فرماں ہیں زمین و آسماں
رشکِ سلطاں ہے گدائے غوثِ پاکؒ
روزِ محشر آسیِؔ بے چارہ کو
بخشنا یا رب برائے غوثِ پاکؒ

---

[1] منزلت [2] حکم جاری بحر و بر پر دیکھ لو

"ردیف ل"

بلبل تو غش میں دیکھ کے بے پردہ روئے گل
گلبن سیاہ مست چڑھا کر سبوئے گل

بلبل بھی ہوتی آئینۂ حسنِ روئے گل
کرتی جو رنگِ گل کی طرح جستجوئے گل

ڈالا شگاف غم نے دلِ عندلیب میں
لو کھل گیا درِ قفسِ آرزوئے گل

وسعت ہے ذوقِ مستیِ بلبل کے واسطے
لبریز رنگِ بادہ سے ہے چارسوئے گل

لڑواؤ گے کبھی نہ کبھی عندلیب سے
گالوں میں رنگِ گل ہے تو بالوں میں بوئے گل

میں اور نالہ ہائے جگر دوزِ آسماں
چوگان آہ بلبلِ شیدا و گوئے گل

سمجھو ہمارے عشق کی حد اپنے حسن سے
آئینہ دارِ حیرتِ بلبل ہے روئے گل

بلبل کو حوصلہ چمنِ کوئے یار کا
کیا ہوش اُس کے جاتے رہے روبروئے گل

بازار و کنجِ خلوتِ عصمت خدا کی شان
آخر شرابِ حسن نے توڑا وضوئے گل

پردہ اٹھا دے روئے حقیقت سے اے صبا
ہر گل ہو بلبلِ چمنِ رنگ و بوئے گل

بلبل کے عشق میں ہو اگر کیفِ معرفت
مینائے سرو میں ہے شراب سبوئے گل

اُس کے سوا تو قابلِ الفت کوئی[1] نہیں
بلبل نے کر دیا مجھے مشتاقِ روئے گل

جز عشق کس میں قوتِ ادراکِ رازِ حسن
بلبل کے اشکِ غم سے بڑھی آبروئے گل

میں جانتا ہوں جذبِ محبت کے معجزے
اے عندلیب غنچۂ منقار و بوئے گل

اس غیرتِ بہار نے عزمِ چمن کیا
آسی نظر پڑے گی کسی کی بھی سوئے گل

---

[1] نہیں کوئی

(۴۴)

ساتوں فلک ہیں نقطۂ نافِ فضائے دل
یعنی نگاہ ہو تو نہیں کچھ ورائے دل

دل جس سے لگ گیا وہی نکلا بجائے دل
یا یوں کہو کہ کچھ بھی نہیں ہے سوائے دل

کچھ ضعف ہے کہ پست ہوئے نالہائے دل
یا چوٹ کھا کے پھوٹ گیا ہے درائے دل

سوگند بے دلوں کی تجھے اے خدائے دل
دینا ہو کچھ مجھے تو نہ دینا سوائے دل

انسانؒ کے لیے نہیں دولت سوائے دل
در در پھرو جہان میں ہو کر گدائے دل

کچھ بھی نہ آرزو ہو' یہ ہے دل کی آرزو
کوئی نہ مُدّعا ہو یہ ہے مُدّعائے دل

اے تیغِ بے گنہ کُشِ ابروئے دل رُبا
ناخن ترا ہے عقدۂ مشکل کشائے دل

تم اور دل میں' اب تو کہوں گا پکار کر
دل کی نہ ابتدا ہے' نہ ہے انتہائے دل

مانگوں تجھؒ میں بہشت تو دوزخ نصیب ہو
تیرے سوا ہو کچھ بھی اگر مُدّعائے دل

؎ اس مصرعہ کے دو نسخے ہیں (۱) کیا جانوں قیمتِ گہرِ بے بہائے دل (۲) دل مل گیا تو سلطنتِ دوجہاں ملی ؎ اگر

عیسیٰ وہی جو زندہ کرے دل مَرا ہوا
بس خضر وہ اُدھر کو جو ہو رہنمائے دل

کشور کشا وہی جسے ہو فتحِ دل نصیب
شاہی اُسی کی جو کہ ہو فرماں روائے دل

رہتا ہوں تیرے دل میں یہ دعویٰ ہے آپ کا
فرمایئے تو کیا ہے مرا مُدعائے دل

دل تھا وہ جس نے کھود کے پھینکا پہاڑ کو
جان اپنی کوہ کن کی طرح کر فدائے دل

رہتے[1] ہو دل میں، واقفِ اسرارِ دل ہو تم
پورا کرو بغیر کہے مُدعائے دل

دل بر سے ملنے[2] کی جو ہوس ہے تو دل کو ڈھونڈھ
راہِ وصالِ یار ہے ذوقِ لقائے دل

ہوتی ہے مستحیل یہ دوزخ کی آگ سے
دیکھو نہ گرم ہو کہیں دل میں ہوائے دل

توحید مُدعا و رہِ عشق واہ وا
دونوں ہیں ایک آئے کسی پر کہ جائے دل

بے تابیٔ فراق میں تا اوجِ بامِ چرخ
دیکھا جو غور سے تو نہ تھا کچھ سوائے دل

صدقے میں اپنے بازوئے اطہر کے یا علیؓ
آسیؔ کو اپنے کیجئے خیبر کشائے دل

---

[1] دل میں ہو اور واقف اسرارِ دل ہو تم [2] دل بر کسی کو سمجھے تھے دشمن کسی کو ہم

"ردیف م"

اے سرِّ تخلیقِ آدمؑ صلی اللہ علیک وسلم
اے نورِ خلّاقِ عالم صلی اللہ علیک وسلم
اے مرے زخمِ جگر کے مرہم صلی اللہ علیک وسلم
اے مرے رشکِ عیسیٰ مریم صلی اللہ علیک وسلم
آپ ہوئے مکّے میں پیدا دینِ حق نے جلوہ پایا
ہو گئے نسخ ادیانِ مقدم صلی اللہ علیک وسلم
کعبہ[1] ہے زاہد کا قبلہ میں تو ہوں تیرا عاشقِ شیدا
قبلہ مرا ترے ابروئے پُرخم صلی اللہ علیک وسلم
آپ ہوئے ناسوت میں پیدا دیکھ لیا لاہوتی جلوا
جلوۂ حق ہے ذاتِ اکرم صلی اللہ علیک وسلم
فرش سے تا سرِ عرشِ اعظم نورانی ہے سارا عالم
پھیلا ہے کیا نورِ مقدم صلی اللہ علیک وسلم
تھا نہیں کچھ بھی نشانِ عالم آپ تھے جب سلطانِ عالم
صدقے آپ کے جانِ عالم صلی اللہ علیک وسلم
فضلِ الٰہی سے ہے اس دم وقتِ حضور سرورِ عالم
کہتے جاؤ یارو پیہم صلی اللہ علیک وسلم
اے مرے مولا اے مرے آقا مرتا ہے اب آسیؔ شیدا
قدموں سے مل کر دیدۂ پُرنم صلی اللہ علیک وسلم

---

[1] کیوں نہ ہو کعبہ سب کا قبلہ [2] زاہد کو مبارک اس کا قبلہ

(۴۶)

ظاہر میں تو ہیں مگر نہیں ہم — دریائے رواں نہ ہوں کہیں ہم

اے روئے سیاہ دیکھ مر کر — کالا[۱] نہ کریں دلِ زمیں ہم

دشمن[۲] سے بھی بوئے دوست آئی — کس سے رکھیں گے بغض وکیں ہم

پچھم تھے ہلال، بدر، پورب — ہر سمت نظر پڑے ہمیں ہم

اس کا بھی تو اب پتا نہیں ہے — لائے تھے یہاں دلِ حزیں ہم

اللہ رے نورِ سجدۂ شوق — مہ رو تم ہو تو مہ جبیں ہم

عاشق سے تو رنگِ رُخ نہ سنبھلا — اُن کو دعوٰے کہ نازنیں ہم

کہتے[۳] ہیں کہ ہم کو کس نے ڈھونڈھا — جو ڈھونڈھے جہاں ملیں وہیں ہم

باتوں کی ہوس میں واعظو تم — جاں دادۂ لعلِ شکّریں ہم

آباد کرو بھی خانۂ دل! — اچھا نہیں تم کہیں، کہیں ہم

تم[۴] چھیڑو لحد میں اے فرشتو — ہیں بندۂ شاہِ مرسلیں ہم

اپنی شیریں کلامیوں سے — لٹواتے ہیں قند و انگبیں ہم

بُت خانہ و کعبہ کچھ نہ جانا — کیا جانیں خلافِ کفر و دیں ہم

ہو جوشِ بہارِ گُل ہمیں کیا — دستار نہ جیب و آستیں ہم

آسیؔ بھی نہ کر سکیں گے انکار
باتیں کہتے ہیں دل نشیں ہم

---

۱ تیرہ ۲ دشمن میں بھی بوئے دوست پائی ۳ ڈھونڈھا بھی کہیں کسی نے ہم کو ۴ کیوں

"ردیف ن"

جو آئی رنگ پر اپنی نحافت آشنائی میں
رہوں گا چور بن کر یار کے دستِ حنائی میں

اسی خط سے سمجھ لو کیسی ظلمت ہے جدائی میں
سوادِ روزِ فرقت ہے جو حل ہے روشنائی میں

ادب آموز نکلا عجز راہِ آشنائی میں
حباب آسا ہیں آنکھوں سے چلا بے دست و پائی میں

اجل رکھی ہے فرقت میں نہ گھبرا اے دلِ مضطر
وصال آسان ہو' جوہر یہ ہے تیغِ جدائی میں

نہ دیکھی عالمِ بالا میں بھی سائل کی کچھ پرسش
بھرا ہے کاسۂ مہ چودہویں شب کی گدائی میں

بھلا خط بھی تو آلیتا تو[1] ہم سے وہ جدا ہوتے
وہ اپنے حسن سے بھی بڑھ کے نکلے بے وفائی میں

عدو کو بھی ہماری طرح وہ بے دل کریں[2] یا رب
خدا ناکردہ کیوں فرق آئے ان[3] کی دل ربائی میں

مٹا دیکھو گے دم بھر میں نشانِ ہستیِ وہمی
حباب آسا جو کھل جائیں گی آنکھیں آشنائی میں

---

[1] تو وہ ہم سے [2] کرے [3] اس کی

تڑپ کر رہ گئے کیوں ہم وہ کیا دیکھا جُدا ہو کر
مگر تیری ہی صورت تھی صنم تیری جدائی میں

یہ کہہ سکتا نہیں کس نے چُرایا نقدِ دل میرا
مگر اتنا کہوں گا چور ہے دستِ حنائی میں

دلِ درویش کی گردشِ ہے دورِ جامِ جمشیدی
مذاقِ سلطنت پایا ترے در کی گدائی میں

نہ کر ترکِ عمل ہرگز کہ اکثر دیکھ لیتے ہیں
رُخِ حُسنِ قبولِ آئینہ زُہدِ ریائی میں

تامّل کر کے جس کو میں نے دیکھا تُو نظر آیا
ترا ثانی نہ نکلا اے صنم ساری خدائی میں

یہ بے ہوشی کہاں کی اٹے شبِ غم صورتِ موسیٰ
مگر کیف مئے دیدار ہے دردِ جدائی میں

کہاں کُشتے یہ سمجھے تھے کہ مثلِ ابروئے پُرخم
خمِ شمشیر بھی پنہاں ہے اُن کی کج ادائی میں

حباب و بحر دونوں ہیں ہمارے قول کے شاہد
کہ ہم عالم سے بیگانے ہیں تیری آشنائی میں

لہ ہے

لباسِ ہستیِ عاشق کو رنگِ شعلہ میں رَنگا
یہ جوہر ہے مےِ دیدار کی رنگیں ادائی میں

کہاں داغی کہاں بے داغ، یہ کیوں کر برابر ہوں
نہ لالہ رنگ میں پائے نہ چاندان کو[1] صفائی میں

کلام اتنا ہے اے بلبل کہ درد ایسا نہیں ممکن
یہ مانا ہم[2] نے تو کچھ کم نہیں رنگیں نوائی میں

بُرا کیوں مانیں ہم، جو بھیس چاہو شوق سے بدلو
ہماری ہی نمایش ہے تمہاری خودنمائی میں

جو حُبِّ زر ہے اے بے مغز الفت سے کنارا کر
حبابِ بحر کو خالی ہی دیکھا[3] آشنائی میں

قدم رکھ سالکِ راہِ طلب کا اپنی آنکھوں پر
بسانِ نقشِ پا کامل اگر ہے رہنمائی میں

کہاں[4] جُبّہ کہاں چھینٹے شرابِ نابِ گل گوں کے
کہو آسیؔ یہ کیا دھبا لگایا پارسائی میں

---

[1] اُس کو [2] مجھ سے [3] پایا [4] کہاں بوسوں کی ٹھہری ہونٹوں پر ہیں داغ مستی کے

(۴۸)

ترے کوچے کا رہنما چاہتا ہوں
مگر غیر کا نقشِ پا چاہتا ہوں

جہاں تک ہو تجھ سے جفا چاہتا ہوں
کہ میں امتحانِ وفا چاہتا ہوں

نظارہ ترا برملا چاہتا ہوں
کہ پردے کی صورت اٹھا چاہتا ہوں

خدا سے ترا چاہنا چاہتا ہوں
میرا چاہنا دیکھ کیا چاہتا ہوں

مگر غیر کے دل میں ہم خانگی ہو
میں سوزِ رقابت بنا چاہتا ہوں

کہاں رنگِ وحدت کہاں ذوقِ وصلت
میں اپنے کو تجھ سے جدا چاہتا ہوں

برابر رہی حدِ یار و محبت
کسی کو میں بے انتہا چاہتا ہوں

کہاں ہے تری برقِ جوشِ تجلی
کہ میں سازو برگِ فنا چاہتا ہوں

وہ جب کھو چکے مجھ کو ہستی سے اپنی
تو کہتے ہیں اب میں ملا چاہتا ہوں

تمہارے سوا کچھ جواب سوجھتا ہو
پر اس سے بھی میں کچھ سوا چاہتا ہوں

محمدؐ کی امت کو تقلیدِ موسیٰ
مگر میں بھی اب کچھ سنا چاہتا ہوں

جنونِ محبت میں پندِ عدو کیا
بھلا میں کسی کا برا چاہتا ہوں

طبیعت کی مشکل پسندی تو دیکھو
حسینوں سے ترکِ وفا چاہتا ہوں

جو دل میں نے چاہا تو کیا خاک چاہا
کہ دل بھی تو بے مدعا چاہتا ہوں

یہ حسرت کی لذت یہ ذوقِ تمنا
شبِ وصل ادھر سے حیا چاہتا ہوں

سوا اس کے میں کیا کہوں تم سے آسی
کہ درویش ہو تم دعا چاہتا ہوں

---

[1] مگر میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں [2] ان سے

(۷۹)

داغِ دل دل بر نہیں سینے سے لپٹاتا ہوں کیوں
میں دلِ دشمن نہیں پھر یوں جلا جاتا ہوں کیوں

رات اتنا کہہ کے پھر عاشق ترا غش کر گیا
جب وہی آتے نہیں میں آپ میں آتا ہوں کیوں

تنگنائے دہرِ فانی کوچۂ جاناں نہیں
قید خانہ سے نکلتے پاؤں پھیلاتا ہوں کیوں

سنگ دل کوئی تو بُت ہے جس سے پہنچی ہے گزند
مثلِ ناقوسِ برہمن ورنہ چلّاتا ہوں کیوں

شمعِ بزمِ دہر ہوں یا شاہدِ عمرِ رواں
ہِل نہیں سکتا جگہ سے پھر چلا جاتا ہوں کیوں

کچھ نہ کچھ بادِ مخالف بزمِ ہستی میں چلی
پیری آئی ہے تو مثلِ شمع تھرّاتا ہوں کیوں

ہجرِ جاناں نے کیا آب و غذا مجھ پر حرام
اشکِ غم پیتا ہوں کیوں خونِ جگر کھاتا ہوں کیوں

کیا اجل بن کر رقیبِ روسیہ آتا ہے آج
نزع کی کیوں کیفیت مجھ میں ہے گھبراتا ہوں کیوں

طرح کا مصرع ہوا ہے جمع کے صیغے کے ساتھ
میں غزل مفرد میں اے آسیؔ کہے[1] جاتا ہوں کیوں

---

[1] پڑھے

۵۰

کوچۂ زلفِ صنم میں اہلِ دل جاتے ہیں کیوں
اور جاتے ہیں تو دل سی چیز چھوڑ آتے ہیں کیوں

شمع کے مانند ہے اپنا بھی کیا سوز و گداز
صورتِ پروانہ دشمن ہم سے جل جاتے ہیں کیوں

کچھ تصور ہے تمہارا، یا تمہیں ہر شے میں ہو
دیکھئے جو چیز آپ اُس میں نظر آتے ہیں کیوں

کوچۂ چاکِ گریباں کوچۂ جاناں نہیں
قطرہ ہائے اشکِ حسرت سر کے بل آتے ہیں کیوں

کوہ کن کہسار میں، صحرا میں مجنوں ہے خراب
چھوڑ کر کوچے کو تیرے ٹھوکریں کھاتے ہیں کیوں

مغزِ سرِّ غیب شاید پوست کندہ کہہ دیا
کھال سرمد کی ہماری طرح کھچواتے ہیں کیوں

جھوٹ کیوں کہتا ہے اے قاصد کہ وہ آتے نہیں
وہ اگر آتے نہیں ہم آپ میں آتے ہیں کیوں

ضعف کے باعث تو ہم بستر سے اُٹھ سکتے نہیں
اب کوئی پوچھے کہ دنیا سے اُٹھے جاتے ہیں کیوں

بھاگتا ہے ہم کناری سے جو وہ دریائے حسن
ہم بسانِ موج دستِ شوق پھیلاتے ہیں کیوں

یا تو اہلِ دل سے تھا ہر دم سوالِ دردِ دل
اب ہجومِ درد ہے دل میں تو گھبراتے ہیں کیوں

اُن کی حسرت کے سوا ہے کون اس میں دوسرا
دل کی خلوت میں بھی وہ عاشق سے شرماتے ہیں کیوں

وعدہ کی شب بھیج دیتے ہیں تصوّر مانگ کا
جب اُنہیں آنا نہیں تو راہ دکھلاتے ہیں کیوں

تو ہی عاشق میں ہے یا کچھ محویت ہے عشق کی
ہر رگ وپے میں تجھے اے جان ہم پاتے ہیں کیوں

مل چکے اب آ کے وہ بچھڑے ہوئے ہوش و حواس
قافلے میں ہم جرس کی طرح[1] چلاتے ہیں کیوں

آرزو[2] یہ ہے تمہارا آنچل آنکھوں سے لگے
کچھ سمجھتے ہو کہ ہم روتے ہوئے آتے ہیں کیوں

روزِ بازارِ جزا ہے اور خالی اپنے ہاتھ
جب سمجھنا تھا نہ سمجھے آج پچھتاتے ہیں کیوں

جائے حیرت ہے طلسمِ اتحادِ حُسن و عشق
آئینہ جب دیکھتے ہیں ہم تجھے پاتے ہیں کیوں

پتلیوں[3] پر چاہیے رکھنا غمِ دل دار کو
داغ ہائے دل ہمارے آنکھ دکھلاتے ہیں کیوں

عاشقانِ زار پر چشمِ توجہ خیر ہے
آپ دامانِ نگہ کانٹوں میں الجھاتے ہیں کیوں

ہم نے مانا دامِ گیسو میں نہیں آتے اسیر
باغ میں نظارۂ سنبل سے گھبراتے ہیں کیوں

---

[1] طور [2] آرزو ہے آپ کے دامن ان آنکھوں سے لگیں

[3] غیر کی صورت میں کیا آیا تصور یار کا

۵۱

غمِ دل بر کے سوا کچھ نہیں اصلا دل میں
جس کو خالی کروں غم بھی نہیں ایسا دل میں

عرش ہے دل میں نہ مسجد ہے نہ کعبا دل میں
سب سہی یار مگر گھر ہے تمہارا دل میں

نالۂ مرغِ نوا سنج نہ تو لا دل میں
باغ کی طرح کہاں رکھتے ہیں کانٹا دل میں

اے خیالِ رُخِ گُل رنگ چلا آ دل میں
پھول بھر دے صفتِ شیشۂ صہبا دل میں

سوئے دشت ایک قدم ایک ترے گھر کی طرف
سر میں سودا ہے تو ملنے کی تمنا دل میں

ہر جگہ خالِ رُخِ یار نے بدلا اک بھیس
تِل[1] بنا دیدۂ عاشق میں، سویدا دل میں

آہِ دل سرو ہے، گل داغ ہیں، نالے بلبل
ہے فراقِ بتِ گل رو چمن آرا دل میں

اشک ہائے غمِ دنداں کو[2] ذرا دھیان میں لا
دے جگہ موتیوں کو صورتِ دریا دل میں

کیمیا گر وہی درویش ہے میرے نزدیک
ہوسِ زر کو کرے خوب جو کُشتا دل میں

آئینے[3] کی طرح اپنی بھی نظر بازی ہے
آنکھ بھر کر جسے گھورا اُسے پایا دل میں

---

[1] تل بنا آنکھ میں عاشق کے [2] ہیں [3] صورت آئینہ

نہ تڑپ اس قدر اے عاشقِ مضطر نہ تڑپ
دھیان اس کا نہ کہیں ہو تہ و بالا دل میں

ڈھونڈتے پھرتے ہیں کھوئے ہوئے دل کو اپنے
ہم نے جس دن سے سُنا گھر ہے تمہارا دل میں

نوُر کے واسطے ظلمت ہے مقدم شاید
پُتلیاں آنکھوں میں ہیں اور سویدا دل میں

ہائے رے چاشنیٔ درد کہ دیتا ہے جگہ
چاک کو غنچۂ گل داغ کو لالا دل میں

داغوں میں روشنیِ شمع سرِ طُور ہے آج
کون ہے اے شبِ غم انجمن آرا دل میں

طے کسی نے نہ کیا ذکرِ لسانی سے سلوک
صورتِ رشتۂ سبحہ ہے یہ رستا دل میں

کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَانٍ کی نیرنگی ہے
دیکھ تو کیا نظر آتا ہے تماشا دل میں

میں کروں دعویٰ اخلاصِ وفا اے توبہ
سر میں سودائے اِرم، اُلفتِ دنیا دل میں

دید ہے عام تو خاصانِ محمدؐ کے لیے
کچھ سمجھتے بھی نہیں حضرتِ موسیٰ دل میں

کارِ امروز بہ فردا مگذار اے آسیؔ
آج ہی چاہیے اندیشۂ فردا دل میں

(۵۲)

جو ترش بھی تم ہو شکر لبو! کبھی جی نہ تم سے بُرا کروں
تم اٹھا کے ہاتھ جو کوسو بھی مَیں اُسی طرح سے دُعا کروں

کوئی میرے دل کو لہو کرے کبھی یہ نہ ہو کہ گِلا کروں
جو بھر آئے منہ میں بھی خونِ دل تو برنگِ غنچہ ہنسا کروں

کبھی دل لیا کبھی جان لی کبھی صبر و ہوش کے سر گئی
جو یہی خوشی تو یہی سہی مجھے لوٹیں وہ میں لُٹا کروں

نہ قصور کچھ ہے رقیب کا نہ گلہ کچھ اس میں حبیب کا
یہ لکھا ہے میرے نصیب کا وہ ستم کریں میں سہا کروں

کبھی روتے روتے گیا ہے جی کبھی مر کے کاٹی ہے زندگی
مری جان پر کبھی رحم بھی کہ اسی طرح سے مُوا کروں

اجی آدمی ہی کی جان ہے مجھے یہ بتاؤ کہ تابہ کے
وہ دغا کرے میں دُعا کروں وہ جفا کرے میں وفا کروں

یہ تھی التجا شب و روز کی مگر اب یقین ہوا یہی
نہ سُنیں گے میری وہ ایک بھی میں ہزار کچھ نہ کہا کروں

یہ ہے حالِ آسیؔ جاں بہ لب کہ کٹے کٹے نہ کٹے یہ شب
اُسے چھوڑ دوں میں خدا پر اب نہ دُعا کروں نہ دوا کروں

ؔ یہ غزل ابتدائی زمانے کی ہے۔

۵۳

ایک جلوے کی ہوس، وہ دمِ رحلت بھی نہیں
کچھ محبت نہیں ظالم تو مروّت بھی نہیں

یاس سے کہیے کہ فرقت ہے تو فرقت بھی نہیں
اور نسبت میں سے تمیز تو وصلت بھی نہیں

اُس کے کوچے میں کہاں کشمکشِ بیم و رجا
خوفِ دوزخ بھی نہیں، خواہشِ جنت بھی نہیں

چمنِ سینۂ پُر داغ میں تیرا جلوہ
یار قابل تری گُل گشت کے جنت بھی نہیں

جو دیا تو نے وہ سب تیرے لیے کھو بیٹھے
ہاں اگر شکر نہیں ہے تو شکایت بھی نہیں

ذوقِ مستی کی مذمت نہ کر اتنی اے شیخ
کیا تجھے نشۂ ذوقِ مئے الفت بھی نہیں

عین معنی ہے وہ دل عاشقِ معنی جو ہوا
ہائے وہ لوگ جو دل دادۂ صورت بھی نہیں

بے نیازی بھی اٹھالوں میں ترے ناز کی طرح
کیا وہ طاقت نہ رہی مجھ میں تو ہمت بھی نہیں

اُن کو کس منہ سے میں نظارگیِ دوست کہوں
صورتِ آئینہ جن آنکھوں کو حیرت بھی نہیں

کس طرح کہیے کہ دیدار دکھایا اُس نے
باغِ جنت بھی نہیں، روزِ قیامت بھی نہیں

زہد و تقویٰ و صلاح و ورع و حسنِ عمل
کچھ نہیں مجھ میں مگر کیا تری رحمت بھی نہیں

اے تمنائے مئے عیش یہ ہے خانۂ دہر
جائے دورِ مئے رنگینیِ صحبت بھی نہیں

جذبِ کامل سے اسے کھینچ لو اے حضرتِ دل
کیسے درویش ہو کچھ تم میں کرامت بھی نہیں

ہوشِ رفتہ دمِ نظارہ یہ فریادی تھے
ہائے دیدار کی صورت دمِ رخصت بھی نہیں

خاک بیزیِ رہِ عشق میں یہ بات چھنی
جس کو ذلت نہیں اُس کو کبھی عزت بھی نہیں

کبھی آسیؔ سے ہم آغوش نہ دیکھا تجھ کو
اثرِ جذبِ دلِ اہلِ محبت بھی نہیں

۱؎ ہے

۵۴

حبابِ بحر یہ کہتے ہوئے اوپر اُبھرتے ہیں
فنا دم بھر میں ہیں دم آشنائی کا جو بھرتے ہیں

لبِ رنگیں کے غم میں اشکِ خوں رو رو کے مرتے ہیں
لہو سے ہم برنگِ لالہ جامِ عمر بھرتے ہیں

عدو کیا دل ہی دل میں رشک سے پس پس کے مرتے ہیں
دلِ وارفتۂ عاشق جو وہ پامال کرتے ہیں

الجھ کر گیسوئے شب رنگ میں فریاد کرتے ہیں
اندھیرے میں مگر طفلِ دلِ عُشّاق ڈرتے ہیں

عدو کیا موت ہے، آنے سے اُس کے ہم جو ڈرتے ہیں
تو کیا عُمرِ رواں ہے جو ترے جانے سے ڈرتے ہیں

یہ نالہ بھی مگر الفت کسی کی ہے جو کرتے ہیں
یہ آہیں دن ہیں گویا زندگانی کے جو بھرتے ہیں

حیا جن کو خدا نے دی بگڑنے میں سنورتے ہیں
اجی غیرت سے رنگ اڑتے نہیں چہرے نکھرتے ہیں

زبانِ تیغِ قاتل سے نہ کچھ چھوٹے یہ ڈرتے ہیں
کہے قاتل تو کیا ہم قتل سے اپنے مکرتے ہیں

کٹے یہ رات کیوں کر ہائے کیا صدمے گزرتے ہیں
نہ وہ آتے، نہ صبر آتا، نہ نیند آتی، نہ مرتے ہیں

بھلا کس منہ سے ہم انکارِ دردِ عشق کرتے ہیں
نہیں ہے کچھ تو کیوں رہ رہ کے دل پر ہاتھ دھرتے ہیں
دلِ صد پارہ نازک طبع اپنا یاد آتا ہے
ہوا کے چلنے سے گلشن میں جب غنچے بکھرتے ہیں
جو آیا اُن کے دامِ فکر میں پھر جا نہیں سکتا
پکڑ کر طائرِ مضموں کو[1] شاعر پر کترتے ہیں
رُخِ مہتاب پر زنگی کے منہ کی پھبتی ہوتی ہے
شبِ مہتاب میں جب وہ نہا دھو کر نکھرتے ہیں
ہے اس میں اور ہم میں آفتاب و شمع کا عالم
وہ جب تک آئے آئے آپ دُنیا سے گزرتے ہیں
ضعیفی ناتوانی دیکھ کر بیمارِ الفت کی
ہرن چشمِ سیہ کے شیر بن بن کر بپھرتے ہیں
وہیں کے ہم برنگِ اشک ہو رہتے ہیں، یا قسمت
جہاں گھر سے نکل کر جوششِ رقت میں ٹھہرتے ہیں
زبانِ خنجرِ پُر آبِ قاتل سے سُنا ہم نے
مسافر قلزمِ غم کے اجل کے گھاٹ اُترتے ہیں
اثر کچھ آہ و نالہ میں، نہ کچھ تاثیر رونے میں
تو پھر نامِ محبت ہم عبث بدنام کرتے ہیں
بہت[2] برہم ہیں گیسو اُن کے، بن کے صورتِ شانہ
جگر صد چاک ہو جائے تو ہم سے بھی سنورتے ہیں

---

[1] کے [2] یہ شعر صاف پڑھا نہیں گیا۔

جو سُنتا ہے برنگِ طائرِ بسمل تڑپتا ہے
دلوں میں تیر بن کر نالے اب تاثیر کرتے ہیں

تنک ظرفی عدوئے ہستیٔ فانی ہے دیکھ لے دل
ہزاروں بُلبلے دن رات پانی پر اُبھرتے ہیں

اسی دل کی بدولت جو نہ ہونا تھا ہوا مجھ پر
میں خوش ہوتا ہوں اب دل پر جو کچھ صدمے گزرتے ہیں

کفِ[۱] افسوس ملنے کا مزا بُلبل سے اب پوچھو
شبابِ فصلِ گُل ہے کلیوں کے جوبن اُبھرتے ہیں

یہ وہ ہیں دیکھ کر جن کو نگاہیں پھر نہیں سکتیں
مگر مُرغِ نگہ کے بھی ستم گر پر کترتے ہیں

نتیجہ زندگی کا عشق بازی کے سوا کیا ہے
حقیقت میں وہی جیتے ہیں بس تجھ پر جو مرتے ہیں

مِرے مے نوش نے اک روز کُلّی مُنہ سے پھینکی تھی
حبابِ بحرِ جامِ بادہ بن بن کر اُبھرتے ہیں

ضرورت کیا دُعا مانگو خدا سے مرگِ عاشق کی
جنازے پر اگر آجاؤ ہم بے موت مرتے ہیں

جرس کی طرح نالاں ہوں میں اپنے منہ کے دلنے سے
جو سالک ہیں وہ روزے رکھ کے طے یہ راہ کرتے ہیں

عداوت ہے سیہ چشموں کو ہم سے بعدِ مُردن بھی
لحد پر جو اُگا سبزہ ہرن آ آ کے چرتے ہیں

---

[۱] یہ شعر صاف پڑھا نہیں گیا

کسی کشتی نشیں کی راہ تکتے ہیں مگر یہ بھی
سراپا چشم ہو کر کیوں حبابِ بحر اُبھرتے ہیں

نہ وہ بے تابیِ دل ہے نہ وہ بے خوابیِ فرقت
لحد میں چین سے عاشق پڑے آرام کرتے ہیں

نہ چاہے گا بھلا کوئی بھی مرنا اپنے دشمن کا
بہت خوش ہوں جو سُنتا ہوں کہ تم پر غیر مرتے ہیں

تمہارا وصفِ دنداں اپنی شرحِ گریہ لکھ لکھ کر
قلم کے منہ کو گویا موتیوں سے آج بھرتے ہیں

کہیں جنبش کی طاقت بھی ہے اب ہم ناتوانوں میں
اُتاریں دل سے وہ ہر چند لیکن کب اُترتے ہیں

لگی کچھ آگ دل میں یا کلیجا ہو گیا پانی
کہ نالے سب ہیں گرما گرم آہیں سرد بھرتے ہیں

بہت گردش سے بھی پھر جاتی ہے آئی ہوئی روزی
یہی پھر پھر کے سنگِ آسیا فریاد کرتے ہیں

بجز عاشق کوئی کیا پائے رمزیں اپنی باتوں کی
تری چشمِ سخن گو کی طرح تقریر کرتے ہیں

یہ متوالا کیا پیرِ مغاں نے آج آسیؔ کو
کہ دستارِ فضیلت رہنِ جامِ بادہ کرتے ہیں

"ردیف و"

فلک سے داد پا جاؤں عدالت ہو تو ایسی ہو
جدا ہوتے ہیں وہ ہم سے قیامت ہو تو ایسی ہو

رُخِ معنی دکھائی دے جو صورت ہو تو ایسی ہو
دلِ صاف آئینہ بن جائے حیرت ہو تو ایسی ہو

دلِ بے مُدعا پایا جو دولت ہو تو ایسی ہو
خدا سے پھر نہ کچھ مانگا قناعت ہو تو ایسی ہو

مرا ہر حرف نکلا شعلہ زارِ وادیٔ ایمن
بہارِ جلوۂ رنگِ طبیعت ہو تو ایسی ہو

مروں بھی اب کہ سانس آنے کی گنجائش نہیں باقی
ہجومِ یاس کی سینے میں کثرت ہو تو ایسی ہو

ہم ایسے غرقِ دریائے گنہ جنت میں جا نکلے
توانِ لطمۂ موجِ شفاعت ہو تو ایسی ہو

قدِ خم ہے گریباں گیر کنٹھا بن کے قاتل کا
مگر[1] بے تابیٔ ذوقِ شہادت ہو تو ایسی ہو

فرشتے سر جھکائیں تیرے سجدہ کو تواضع سے
سُن او مٹی کے پُتلے آدمیت ہو تو ایسی ہو

---

[1] اگر

اگر دانا ملا پانی نہ طفلِ اشک نے مانگا
وہی دانا، وہی پانی، قناعت ہو تو ایسی ہو

نہ دن بھر چین آتا ہے نہ نیند آتی ہے راتوں کو
کسی کے حال پر ان کی عنایت ہو تو ایسی ہو

دلِ کافر کی اندھیاری معاذ اللہ معاذ اللہ
مگر[1] تاریکیِ شب ہائے فرقت ہو تو ایسی ہو

تعجب ہے کہ تجھ کو اپنے سینے میں نہ کیوں ڈھونڈھا
کسی کو اپنی ہستی سے جو غفلت ہو تو ایسی ہو

جہاں ملنے کی ٹھہرے مجھ سے میں بھی اے صنم گم ہوں
سوا تیرے نہ ہو کوئی جو خلوت ہو تو ایسی ہو

گرا جو قطرۂ خوں لالہ زارِ داغِ حسرت ہے
مگر شادابیِ رنگِ شہادت ہو تو ایسی ہو

پکارا اس نے اپنا نام لے کر رات آسیؔ کو
نہیں اب کچھ بھی غیریّت، محبت ہو تو ایسی ہو

---

[1] اگر

(۵۶)

تمہیں کثرت سے نفرت اور محوِ ذوقِ وحدت ہو
کچھ اس سے اور بڑھ جاؤ تو وحدت ہو نہ کثرت ہو

نہ ستاری کو شرم آئے نہ غفاری کو غیرت ہو
قیامت میں ترا بندہ ترے آگے فضیحت ہو

مری نظروں میں تو ہو، ڈر ترا، تیری محبت ہو
نہ دنیا ہو، نہ عقبیٰ ہو، نہ دوزخ ہو، نہ جنت ہو

سوا تیرے نہ مائل ہو کسی پر وہ طبیعت دے
تری اُلفت ہو، تیرا عشق ہو، تیری محبت ہو

مجھے ہر طرح کی خود بینیوں سے کردے بے گانہ
جو آئینہ بھی میں دیکھوں نمایاں تیری صورت ہو

ہماری دید میں، فہمید میں، دے ایسی یک رنگی
کہ صورت عینِ معنی اور معنی عینِ صورت ہو

ہمارے قتل کی نوبت اگر آجائے مقتل میں
الٰہی دستِ قاتل میں تری تیغِ محبت ہو

انیسِ خلوتِ تنہائیٔ کنجِ لحد میرا
ترا لطف و کرم، تیری عنایت، تیری رحمت ہو

ہم ایسے بدنصیبوں کی لحد اور اس کو تو روندے
ترا ہر نقشِ پا رشکِ بہارِ ہشت جنت ہو

کہیں اکسیر سے بڑھ کر ہے دولت خاکساری کی
جہادِ نفس کا شاید یہی مالِ غنیمت ہو

وہ بُرقع سے نکالا چاہتے ہیں روئے زیبا کو
یہاں جو غیر ہوں کہہ دو کہ اب تم لوگ رخصت ہو

کہاں وہ خواہشِ بالین و بالش اب بجز اس کے
کہ سر ہو اور سنگِ آستانِ بابِ رحمت ہو

کیا یہ لاغر و کاہیدہ فرقت نے کہ مرنے پر
تمہارا نقشِ پا ہی مجھ کو کافی بہرِ تربت ہو

جنابِ شیخ! زہدِ خشک سے کیا کام نکلے گا
درِ پیرِ مغاں ہو اور دُختِ رز سے صحبت ہو

(۵۷)

جان دو دن کی ہے مہمان ستاتے کیوں ہو
آپ روتے ہوئے آئے ہیں رُلاتے کیوں ہو

تم نہیں کوئی تو سب میں نظر آتے کیوں ہو
سب تمہیں تم ہو تو پھر منہ کو چھپاتے کیوں ہو

بال زلفوں کے ہیں عشاقِ سیہ بخت نہیں
جب نہ تب سامنے سے اُن کو ہٹاتے کیوں ہو

ہم نہ تابوتِ عدو ہیں نہ رہ و رسمِ وفا
آپ اُٹھ جائیں گے، تم ہم کو اُٹھاتے کیوں ہو

دل ملا مجھ کو ازل میں تو کسی نے نہ کہا
روگ ہے یہ اسے چھاتی سے لگاتے کیوں ہو

آگیا ہوں تو میں کچھ صبحِ شبِ وصل نہیں
اپنی آغوش سے دشمن کو اُٹھاتے کیوں ہو

دہنِ زخم ولبِ غنچہ یہ کرتے ہیں سوال
کہ لہو تھوکنے کو ہم کو ہنساتے کیوں ہو

ہم سیہ بخت ہیں اُٹھیں گے دھوئیں کی صورت
دیکھو پھر روؤ گے محفل سے اُٹھاتے کیوں ہو

خشک شے جھونکتے ہیں آگ میں، دستور یہ ہے
لائے جو دامنِ تر اُن کو جلاتے کیوں ہو

اُن کے رخساروں سے کہتا ہے چراغِ خورشید
صورتِ شمعِ سحر ہم کو بجھاتے کیوں ہو

جیتے جی ہجر کے صدموں نے[۱] تو سونے نہ دیا
آج تربت میں مجھے آکے سلاتے کیوں ہو

تم پری زاد ہو، وعدہ تو پری زاد نہیں
آپ اُڑتے ہو اُڑو، بات اُڑاتے کیوں ہو

جب[۲] نہیں غیر کو دیدار دکھانا منظور
صفتِ پردۂ در ہم کو اُٹھاتے کیوں ہو

پھونک دو نخلِ دلِ زار کہ جڑ روگ کی ہے
شجرِ وادیٔ ایمن کو جلاتے کیوں ہو

ہم نے مانا کہ وہ آنکھیں نہیں جادو آسیؔ
رات بھر وصل میں پھر اُن کو جگاتے کیوں ہو

---

۱ سے ۲ جو

۵۸

اس طرح درد سے لبریز جو تقریر نہ ہو
سخنِ آسیؔ شیدا غزلِ میرؔ نہ ہو

نہ سہی غیر مری خوبیِ تقدیر نہ ہو
وہ چلے آئیں اگر کوئی عناں گیر نہ ہو

منہ ترا چشمِ سخن سنج کی تصویر نہ ہو
جو خموشی میں بھری شوخیِ تقریر نہ ہو

دیکھ اے حسنِ دل آرا، کوئی دل گیر نہ ہو
نوجوانی کو سکھا دے کہ وہ بے پیر نہ ہو

صاف دیکھا ہے کہ غنچوں نے لہو تھوکا ہے
موسمِ گل میں الٰہی کوئی دل گیر نہ ہو

قید خانے میں کوئی غیرتِ یوسف بھی ہے
دل اٹک جائے، نہ ہو پاؤں میں زنجیر نہ ہو

جس کو دیکھا اُسے چھاتی سے لگائے رکھا
دل جسے کہتی ہے خلقت تری تصویر نہ ہو

ہائے وہ حال کہ گھبرا کے وہ خود بول اُٹھے
دل کو پکڑے ہوئے کیوں بیٹھے ہو دل گیر نہ ہو

تھک گیا نالہ، جگہ سے نہ ہلا وہ ظالم
نوجواں یار ہمارا فلکِ پیر نہ ہو

مجھ سے دیوانے کو روکیں گے یہ محبس والے
قیدِ زنجیر تری خوبیِ تقدیر نہ ہو

آ کے پھر جا نہ سکا پائے خیالِ جاناں
چشمِ بے خواب مگر دیدۂ زنجیر نہ ہو

ٹکڑے ہو کر جو ملی کوہ کن و مجنوں کو[1]
کہیں میری ہی وہ پھوٹی ہوئی تقدیر نہ ہو

چاند سنتے تھے مگر غیرتِ خورشید وہ ہیں
اُن کے آنے میں یہی باعثِ تاخیر نہ ہو

وہ بھی کچھ عشق ہے جو درد کی لذت نہ چکھے
وہ بھی نالہ ہے جو حسرت کشِ تاثیر نہ ہو

جی ہے دُنیا سے خفا بہرِ خدا جانے دے
ناتوانی تو میرے پاؤں کی زنجیر نہ ہو

ہائے اُس شخص کی قسمت جسے وہ روگ ملے
جز ترے ملنے کے جس کی کوئی تدبیر نہ ہو

---

[1] جو بٹی کوہ کن و مجنوں میں

کوئے جاناں سے ارادہ ہے نکل جانے کا
یا الٰہی کوئی جز موت گلو گیر نہ ہو

باندھتے ہیں سرِ فتراک سے پر ڈر ڈر کر
کہ خزانِ چمنِ حسرتِ نخچیر نہ ہو

حاصلِ صحبتِ غم ناک بجز غم کیا ہے
دل مرا لیتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ دل گیر نہ ہو

جس نے منہ بند کیا رات مرے نالے کا
لذتِ چاشنیِ حسرتِ تاثیر نہ ہو

آج بچپن میں تو ہیں فتنۂ افلاک مرید
نوجوانی میں فلک کا بھی کہیں پیر نہ ہو

زلف سلجھانے میں گھبرا کے یہ کہنا اُن کا
کسی دیوانے کی الجھی ہوئی تقریر نہ ہو

کارسازا یہی آسیؔ کی دُعا ہے تجھ سے
کام میرا کوئی منت کشِ تدبیر نہ ہو

(۵۹)

دردِ دل کی کوئی تدبیر طبیبو لکھ دو
دارُوئے عاشقِ دل گیر طبیبو لکھ دو

خاکِ کوئے بُتِ بے پیر طبیبو لکھ دو
یہ دوا مجھ کو ہے اکسیر طبیبو لکھ دو

مشکِ نافہ مرے نسخہ میں جو لکھنا ہو تمہیں
گرہِ زلفِ گرہ گیر طبیبو لکھ دو

کیا دوا لکھتے ہو صحت جو مری چاہتے ہو
سنبلِ زلفِ گرہ گیر طبیبو لکھ دو

زلفِ شب رنگ کے سودا کو نہ ہوگی صحت
ڈال دیں پاؤں میں زنجیر طبیبو لکھ دو

لکھ دو کافورِ بناگوش مرے نسخہ میں
صبحِ عارض کی طباشیر طبیبو لکھ دو

میری جانب بھی وہ بُت چشمِ کرم سے دیکھے
نسخۂ سرمۂ تسخیر طبیبو لکھ دو

نہ لکھو بہر خدا عنبرِ اشہب مجھ کو
خالِ روئے بُتِ بے پیر طبیبو لکھ دو

جوش دینے کو علاج تپِ دل کو میرے
آتشِ نالۂ شب گیر طبیبو لکھ دو

خیر! اب اور تو کیا آسیؔ بے تاب کہے
وہ دوا جس میں ہو تاثیر طبیبو لکھ دو

لہ ہے سہ ہو اگر سہ کے

۶۰

دکھائے حُسن کے غمزے جو اپنے شیدا کو
بجا سمجھنے لگا ناز ہائے بے جا کو

کسے دکھائے وہ رویا میں روئے زیبا کو
کہ نیند ہجر میں آئی تھی بس زلیخا کو

تمام عمر کی تکلیف سے فراغت ہے
متاعِ بیش بہا جان جوشِ سودا کو

کہاں دل اور کہاں اُس کے حُسن کا جلوہ
کیا ہے عشق نے کوزے میں بند دریا کو

ہمارے خانۂ دل کو اگر کیا برباد
کہیں جگہ نہ ملے گی تیری تمنا کو

ہنوز تفرقۂ جلوہ کچھ نظر میں نہیں
پسند کیجئے کعبے کو یا کلیسا کو

کہیں کنارہ ہے اس کے محیطِ ہمت کا
جو عین پیاس میں سمجھے سراب دریا کو

ہم اپنے شکوؤں کی قوت سے بوالہوس ٹھہرے
کہ ہوشِ بحث کہاں عاشقانِ شیدا کو

وہ سرو قد ہے کہ مینائے دل رُبا کوئی
بھرا ہے حُسن نے صہبائے تابِ فرسا کو

ہوا کے رُخ تو ذرا آکے بیٹھ جائے قیس
نسیمِ صبح نے چھیڑا ہے زلفِ لیلا کو

سمجھ کے محتسبو، دین و دل کی خیر نہیں
کہ اُس کی آنکھوں سے نسبت ہے جام وصہبا کو

ہے میل راہِ ہدایت، الف نہ پیچ میں جان
اشارہ ہے کہ سمجھ ایک لا و اِلّا کو

کمی نہ جوشِ جنوں میں نہ پاؤں میں طاقت
کوئی نہیں جو اُٹھا لائے گھر میں صحرا کو

لگالے خاکِ رہِ مے فروش آنکھوں میں
کہ نُورِ بادہ دکھاتے ہیں چشمِ بینا کو

میں سخت جاں نہیں جلّادِ عشق نے ناحق
کیا شریکِ الم ہائے روح فرسا کو

بہارِ خلد ہے اندھوں کے واسطے شاید
کہ کچھ نظر نہیں آتا ہے چشمِ بینا کو

اگر قبول کرو جلوہ بے حجابانہ
دکھاؤں محشرِ ہنگامۂ تمنا کو

ہماری خاک فشانی کی حد بھی کچھ سمجھو
کہ بال بال میں بھر لائے دشت وصحرا کو

عوض نہ چرخ سے مشکل نہ بخت و دشمن سے
مگر نہ کام میں دیکھوں جو کارفرما کو

ہماری حسن پرستی محلِ طعن نہیں
کہ چشمِ قیس سے دیکھا ہے روئے لیلا کو

نبی بھی ہو تو نہ کچھ زور جذبِ دل سے چلے
وصالِ حضرتِ یوسف ہوا زلیخا کو

اگرچہ وعدۂ فردا ہے بے خلاف ضرور
مگر وہ چاہے تو امروز کر دے فردا کو

میں جاں بہ لب تو نہیں شکوہ کیا ابھی اس کا
نہ چومنے دے جو لب ہائے روح فرسا کو

ہمارے نالوں کو سُن کر کبھی نکل نہ پڑے
پسند کرتے ہیں محشر کے شور و غوغا کو

خبر تو لو کوئی آسیؔ کو زندہ کس نے کیا
یہ معجزہ تو ملا تھا کبھی مسیحا کو

(۶۱)

جو یہ ضد ہے کوئی بلبل کی صورت نعرہ زن کیوں ہو
کوئی گل فام کیوں ہو، گل بدن، گل پیرہن کیوں ہو

ہمارے بعد تو بدنام اے رشکِ چمن کیوں ہو
ہمیں جب ڈوب ہی مرنا ترا چاہِ ذقن کیوں ہو

تمہیں سچ سچ بتاؤ کون تھا شیریں کے پردے میں
کہ مشتِ خاک کی حسرت میں کوئی کوہ کن کیوں ہو

سُن اے بدمست! موجِ دُردِ صہبا بھی مصدق ہے
نہ دل میں کچھ کدورت ہو تو چہرے پر شکن کیوں ہو

نگاہِ ناز کے سر، خون ثابت ہو گیا آخر
ہم ایسے خستہ جانوں پر کوئی ناوک فگن کیوں ہو

نہ مشقِ پردہ داری ہو اگر بے تابیوں میں بھی
یہ دردِ دل نقابِ جلوۂ عاشق فگن کیوں ہو

نہ ہو منظورِ حُسن و عشق اگر محشر بپا کرنا
قد اُس کا فتنہ خیز، آہِ جگر، گردوں فگن کیوں ہو

وہ میرا گھورنا، آنکھیں جھکانا شرم سے اُن کا
الٰہی ناوکِ ذوقِ نظر آہو فگن کیوں ہو

کرشمہ کچھ نہ ہو اُس میں جو تیری چشمِ مے گوں کا
شرابِ جلوۂ حُسنِ غنا صوفی فگن کیوں ہو

کسی پروانے کے جل بجھنے کا غم ہو جو اے آسیؔ
نکل کر کوئی خلوت سے چراغِ انجمن کیوں ہو

(۶۲)

دل پیرِ مغاں میں چاہیے اے دل ترا گھر ہو
وہی مے نوش جو نورِ نگاہِ چشمِ ساغر ہو

اگر دل کو یہ چاہو تم کہ منزل گاہِ دلبر ہو
تو جو ہو غیر، تم ہو یا کہ غیر، اس گھر کے باہر ہو

بہر صورت طلب لازم ہے آبِ زندگانی کی
اگر پایا خضر تم ہو، نہیں پایا سکندر ہو

کوئی تو پی کے نکلے گا اڑے گی کچھ تو بو منہ سے
درِ پیرِ مغاں پر مے پرستو چل کے بستر ہو

ہیولیٰ ہو شبِ دیجور کا میرا غبار اب تک
کسی کا ذرہ ذرہ[1] آفتابِ روزِ محشر ہو

تمہاری ہی بدولت ہے یہ ساری رندی و مستی
وہ دن بھی ہو کہ تم ہو، ہم ہوں، دورِ جامِ کوثر ہو

فراق و وصل کے جھگڑے میں ڈالا مجھ کو ظالم نے
غبارۂ ہستیٔ وہمی جو اُڑ جائے تو بہتر ہو

کبھی تم نے بھی چاہا ہے کسی کو، لو تمہیں کہہ دو
نہ[2] آؤ تم میرے پاس اور صبر آئے، یہ کیوں کر ہو

کسی در پر پڑا رو رو کے آسیؔ رات کہتا تھا
کہ آخر میں تمہارا بندہ ہوں تم بندہ پرور ہو

---

[1] نگارۂ ہستیٔ وہمی جو مٹ جائے تو بہتر ہو [2] واقعۂ شبِ معراج

۶۳

نہ مرض کچھ ہے، نہ آسیب، نہ ستایا ہم کو
اک پری زاد نے دیوانہ بنایا ہم کو

ہائے قدموں سے بھی اک دن نہ لگایا ہم کو
دھیان میں خاک برابر بھی نہ لایا ہم کو

دل کی بے تابیوں سے[1] طائرِ بسمل کی طرح
خاک پر اُس کی جدائی نے[2] لُٹایا ہم کو

ہم مریں بھی تو نہ ہو اُس کو یقینِ الفت
نیم جاں جس کی محبت نے بنایا ہم کو

ہائے اک چاند کے ٹکڑے نے ستارے کی طرح
مدتوں شام سے تا صبح جگایا ہم کو

ہم نہ کہتے تھے کہ اے دل نہ کسی پر جی دے
زندگی روگ ہے اب تجھ کو 'بتا' یا ہم کو

تیرے تلووں کی چھڑائی ہوئی مہندی کی طرح
خاک میں تیری جدائی نے ملایا ہم کو

رہ گیا مثلِ کتاں پھٹ کے جگر سینے میں
چاند سا چہرہ یکایک جو دکھایا ہم کو

دیکھئے خاک میں ہم مل گئے مانندِ سرشک
آپ نے کس لیے آنکھوں سے گرایا ہم کو

دردِ فرقت سے بچیں گے تو کہیں گے چل کر
شکر کر شکر، بھلا زندہ ہی[3] پایا ہم کو

جان ہم سمجھے تھے جس کو وہ ہمیں دل سمجھا
ہائے کس پیار سے پہلو میں بٹھایا ہم کو

آج تک بات وہ یاد آ کے گلا گھونٹتی ہے
وقتِ رخصت جو گلے اُس نے لگایا ہم کو

لاغری میں تری صدقے، کہ سمجھ کر تنکا
پھڑکی آنکھ اُن کی تو آنکھوں سے لگایا ہم کو

وصل کی رات بھی اُس رشکِ چمن نے آسیؔ
صورتِ شبنمِ گل خوب رُلایا ہم کو

---

[1] نے [2] میں [3] بھی

۶۴

عشق سے عشق، محبت سے محبت مجھ کو
اس قدر ذوقِ بلا، شوقِ مصیبت مجھ کو

تا بہ کے حسرتِ وصل و غمِ فرقت مجھ کو
اپنی ہستی سے کسی طرح ہو غفلت مجھ کو

ہوں گنہگار مگر حسرتِ دیدار نہ پوچھ
جلوہ تیرا ہو تو دوزخ بھی ہے جنت مجھ کو

میں بھی باطل، مری ہستی بھی سراسر باطل
یہ سوجھائی ہے انا الحق کی حقیقت مجھ کو

عشق میں کوہ کنی کوئی بڑی بات نہیں
پاؤ گے لجۂ بے ساحلِ ہمت مجھ کو

وہ نہ بے باکیوں سے خوش نہ ہوس ناکی سے
ہو گئے غیر کے اعمال نصیحت مجھ کو

نورِ خورشید ستاروں کو مٹا دیتا ہے
تم ہو پہلو میں تو محفل بھی ہے خلوت مجھ کو

کہتے ہیں تم کو جو دیکھا تو خدا کو دیکھا
خواب میں بھی تو میسر ہو یہ دولت مجھ کو

کوئے محبوب سے کوئی بھی نکل سکتا ہے
اپنے اوہام ہوئے وادیٔ غربت مجھ کو

کیا خبر تھی کہ انہیں کے ہیں کرشمے سب[1] کچھ
شکوۂ غیر کی ہے ان سے ندامت مجھ کو

بے حجابی کبھی ممکن نہیں جب تک میں ہوں
خلل انداز ہوں کر دیجئے رخصت مجھ کو

عندلیبِ گلِ رخسار ہی سب جانتے ہیں
تیرے پردے نے کیا یار فضیحت مجھ کو

اب تو دیدار دکھا دیجئے، تقصیر معاف
ہو گیا وعدۂ فردا ہی[2] قیامت مجھ کو

کیوں نہ ہوں خاکِ درِ یار کہ پھر خاک نہ ہوں
آسیؔ اپنی بھی نہیں خاک محبت مجھ کو

---

[1] سارے [2] بھی

(۶۵)

کہتے ہو کہ اور کو نہ چاہو
معلوم ہوا کہ تم خُدا ہو

ہاں واعظو اور کو نہ چاہو
اپنے دل کے تو آشنا ہو

دل کا بھی جو کوئی آشنا ہو
کیا جانے وہ ہوتے ہوتے کیا ہو

رہرو جو ملے تو رہ نما ہو
کچھ اور نہ ہو تو نقشِ پا ہو

اُن سے ملنا ہوُا ہے مشکل
اے وہم عدو ترا بُرا ہو

طعنے ہیں سجودِ پائے بُت پر
واعظ کو جو کچھ بھی سوجھتا ہو

ہمت ہے تو راہ مختصر ہے
اے ننگِ طلب بس اُٹھ کھڑا ہو

تم اور دعائے مرگِ عاشق
کیا پھر وہ مرے جو مر چکا ہو

نکلا ہے کوئی تو اُن کے در سے
یارب! میرا وہ مُدعا ہو

بدمست پڑا ہے محتسب بھی
اے موسمِ گُل ترا بُرا ہو

اللہ رے لذتِ شفاعت
کیا جانو تم اس کو بے گناہو

تدبیرِ خدنگِ جلوہ کیا ہے
دل تھامے ہوئے پڑے کراہو

۶۶

خاک ہم گردش نصیبوں کو میسّر گھر نہ ہو
اے جنوں جب تک بگولوں کی طرح چکّر نہ ہو

راہ وہ چلیئے کہ غیرِ جذبِ کامل سر نہ ہو
نقشِ پا تک گم ہو میلِ راہ بھی رہبر نہ ہو

خوف ہے بازار میں بکنے لگے کوڑی کے مول
صورتِ گل میرے یوسف جامے سے باہر نہ ہو

آبرو بحرِ رضا میں پائی ہے مثلِ گہر
چھید ڈالو دل جو میرا، آنکھ ہرگز تر نہ ہو

مفلسی پژمردگی ہے غنچۂ گلشن سے پوچھ
آئے کیا منہ پر ہنسی مٹھی میں جب تک زر نہ ہو

بلبلے کی طرح اے دیوانۂ نازک دماغ
سر وہ پیدا کر کہ جس کو حاجتِ افسر نہ ہو

دیکھئے کیا سنگ دل ہوتے ہیں اہلِ آبرو
لعل کا دل تو لہو ہو چشم گوہر تر نہ ہو

چھلکی پڑتی ہے اُن آنکھوں سے شرابِ بےخودی
سُرمے کی تحریر کا حلقہ خطِ ساغر نہ ہو

یہ وہ کاوش ہے جو کرتی ہے کلیجہ پاش پاش
صورتِ غنچہ کبھی دل خوں برائے زر نہ ہو

آخر اِک دن اے گلِ تر تجھ[1] کو مرجھانا پڑا
اس قدر بھی اپنے جامے سے کوئی باہر نہ ہو

بارِ غم اپنے شہیدانِ محبت ہی کو دے
بوجھ اُٹھانے کو مگر پھر احتیاجِ سر نہ ہو

دولتِ[2] عشق آدمی کو کرتی ہے کیا سربلند
مہرِ گردوں تیرے سودائی کا داغِ سر نہ ہو

تیرے پروانوں کے مجمع میں سرافرازی کہاں
داغِ سوزاں شمع ساں جب تک کہ تاجِ سر نہ ہو

ہونٹ سُوکھے اور آنکھیں تر ہیں، چہرہ زرد ہے
تہمتِ عشق اس بڑھاپے میں کہیں مجھ پر نہ ہو

وہ طریقِ پیرِ مے خانہ سے ہے بہکا ہوا!
جادۂ راہِ فنا جس کو خطِ ساغر نہ ہو

کیجئے پیدا لطافت، ہے اگر شوقِ عروج
طائرِ جاں اُڑنے میں محتاجِ بال و پر نہ ہو

عشق آئینہ ہے گویا عاشق و معشوق میں
دل کی حالت جو اِدھر ہے وہ اُدھر کیوں کر نہ ہو

آنسو آنکھوں میں بھر آئے سُن کے آسیؔ کا کلام
درد ہو دل میں تو باتوں میں اثر کیوں کر نہ ہو

---

[1] دیکھ [2] یہ شعر بیاض میں کٹا ہوا ہے۔

۶۷

غم[1] دُور کرو عیش کا سامان دکھا دو — یا پیر! مرے درد کا درمان بتا دو

کچھ طُور کے سُرمے کی ضرورت نہیں مجھ کو — خاکِ قدم اپنی مری آنکھوں سے لگا دو

بے پردہ ملو عاشقِ بے تاب سے اپنے — حائل ہے جو یہ بیچ کا پردا سو اُٹھا دو

موہوم سی یہ رہ جو گئی ہے مری ہستی — تم حرفِ غلط کی طرح اس کو بھی مٹا دو

شعلے کی طرح پھونک دے جو دل کو، جگر کو — لِلّٰہ کوئی ایسی مئے تُند پلا دو

یہ ظرف میں وسعت ہے کبھی[2] مُنہ سے نہ نکلے — مے خانے کا مے خانہ اگر مُنہ سے لگا دو

جس دل میں ہو تمؔ تم سے نہ خالی وہ کبھی ہو — ہے جائے دُعا تم بھی ذرا دل سے دعا دو

کب تک میں تحمّل کروں جھگڑے من و تو کے — اک بار دو عالم کے بکھیڑے سے چھُڑا دو

ہے عشق وہ شعلہ کہ پھُنکا جاتا ہے تن من — اس آگ کو بھڑکا کے خودی میری جلا دو

موسیٰ کی طرح گر پڑے غش کھا کے خدائی — بُرقعِ رُخِ روشن سے ذرا سا جو ہٹا دو

سوتا ہے اسی نیند میں غافل ابھی آسیؔ
اپنے قدمِ پاک کی ٹھوکر سے جگا دو

---

[1] یہ غزل بالکل لڑکپن کی ہے [2] کر بس

قطعہ

بسانِ معنیِ موزُوں کبھی صورت میں آجاؤ
اگر صورت میں آجاؤ تو مجھ کو بھی دِکھا جاؤ
مگر تم حوُر ہو، انسان ایسا ہو نہیں سکتا
اگر انسان ہو، عاشق کی آنکھوں میں سما جاؤ

فرد

زینتِ مسجد دعا ہم سوختہ جانوں کی ہے
دودِ دل ہوتا ہے وسمہ ابروئے محراب کو

فرد

جو کہیں ہم زبان سے ہو جائے
منہ میں لیکن کہیں زبان بھی ہو

فرد

جو ہو سکے تو جئے اس طرح زمانے میں
کہ مر بھی جائے تو مرگ اس کی زندگانی ہو

"ردیف ہ"

آئے مثلِ شمع چشمِ نم کے ساتھ
جاتے ہیں رو دھو کے داغِ غم کے ساتھ

مثلِ نَے ہم عاشقِ نالاں بھی ہیں
نالۂ دل کش ہے اپنا دم کے ساتھ

دستِ غم دستِ اجل سے کم نہیں
دم نکل جاتا ہے ہر ماتم کے ساتھ

حیرت آگیں دیکھتا ہے آئینہ
منہ تمہارا دیدۂ پُر نم کے ساتھ

جھومتا جاتا ہے آسیؔ حشر میں
عاشقانِ سرورِ عالم کے ساتھ

"ردیف ی"

جز فنا عشق میں تدبیر مقدر نہ ہوئی
زندگی موت سے آخر کبھی جانبر نہ ہوئی

ہائے منہ پھیر کے ظالم نے کیا کام تمام
وصل تو وصل جُدائی بھی میسّر نہ ہوئی

گھٹ گئی وصل میں، فرقت میں بڑھی تھی جتنی
رات عاشق کی کبھی دن کے برابر نہ ہوئی

زیست انسان کی تا روزِ قیامت معلوم
جان لو ساعتِ دیدار مقرر نہ ہوئی

غیرِ محبوب حجاب رُخِ محبوب نہ تھا
مجھ سے تدبیرِ علاجِ دلِ مضطر نہ ہوئی

وہ نہ تھا ہم سے جُدا ہم بھی جُدا اُس سے نہ تھے
نہ ہوئی پھر جو ملاقات تو کیوں کر نہ ہوئی

کیوں چھُری پھرتی گلے پر نہ پہونچا اے کاش
میری قسمت پرِ پروازِ کبوتر نہ ہوئی

جُزوِ تن ہو کے کسی رشکِ چمن کے ہوتے
لاغری رُو کشِ رگہائے گُلِ تر نہ ہوئی

طولِ شب ہائے جدائی کو نہ پوچھو مجھ سے
زلفِ جاناں سے کمی بال برابر نہ ہوئی

بےکسی میں شبِ غم موت تو سوئی تھی کہیں
سانس آئی بھی جو کم بخت تو خنجر نہ ہوئی

غیر کا دھیان تک اب دل میں نہیں رشک کہاں
بس محبت وہ تمہاری ہے کہ باہر نہ ہوئی

ذرہ ذرہ سے ہُوا شورِ انا الشمس بلند
ایک میں ہوں کہ توجہ تری مجھ پر نہ ہوئی

سالکِ راہِ فنا مجھ سے تعلّی کی نہ لے
جان کس کو غمِ محبوب میں دو بھر نہ ہوئی

زندگی کا نہ ادا خاک ہوا حق آسی
جان جب خاکِ رہِ آلِ پیمبرؐ نہ ہوئی

(۷۰)

کلیجا منہ کو آتا ہے شبِ فرقت جب آتی ہے
اکیلے منہ لپیٹے روتے روتے جان جاتی ہے

لبِ نازک کے بوسے لوں تو مِسّی منہ بناتی ہے
کفِ پا کو اگر چوموں تو مہندی رنگ لاتی ہے

دکھاتی ہے کبھی بھالا، کبھی برچھی لگاتی ہے
نگاہِ نازِ جاناں ہم کو کیا کیا آزماتی ہے

وہ بکھرانے لگے زلفوں کو چہرے پر تو میں سمجھا
گھٹا میں چاند یا محمل میں لیلےٰ منہ چھپاتی ہے

بلائے جاں ہوئیں میرے لیے آرائشیں اُن کی
نہ مہندی پاؤں چھُونے دے نہ مِسّی منہ لگاتی ہے

کرے گی اپنے ہاتھوں آج اپنا خون مشاطہ
بہت رچ رچ کے تلووں میں ترے مہندی لگاتی ہے

نہ کوئی جوڑ اُس عیار پر اب تک چلا اپنا
یہاں دم ٹوٹتا ہے اور دم میں جان جاتی ہے

تڑپنا[۱]، تِلملانا، لوٹنا، سر پیٹنا، رونا
شبِ فرقت، اکیلی جان پر سو آفت آتی ہے

پچھاڑیں کھا رہا ہوں، لوٹتا ہوں دردِ فرقت سے
اجل کے پاؤں ٹوٹیں کیوں نہیں اس وقت آتی ہے

نہ نہرِ باغ پر ہے[۲] بند اے آسیؔ نہ شبنم پر
خدائی میری حالت دیکھ کر آنسو بہاتی ہے

---

۱ یہ شعر بیاض میں کٹا ہوا تھا ۲ موقوف ہے۔

(٧١)

نہ سنتے تم جو دشمن کی زبانی — بہت دلچسپ تھی میری کہانی

کہو بے جا ہے میری بدگمانی — کہاں دشمن کہاں رازِ نہانی

گلا حاضر ہے لیکن فائدہ کیا — کہ ظالم تو ہے میری زندگانی

عداوت انتہائے دوستی ہے — عدوئے جاں ہے میرا یارِ جانی

تسلّی کل کے وعدے پر غضب ہے — غمِ عشق اور امیدِ زندگانی

کہاں یوسف کہاں وہ روئے زیبا — خدا کو ہے مجھے صورت دکھانی

مرے دل کی تمنا ہے مگر تو — سُن اے بحرِ کرم یہ بیکرانی

مآل اس کا قیامت ہے قیامت — وہ آفت کی جگہ ہے دارِ فانی

نہ سمجھا میں تو دشمن ہی سمجھتا — محبت ہے خرابی کی نشانی

نظر آجا کہیں اے جسمِ لاغر — دکھاؤں کیوں کر اُس[1] کو ناتوانی

بس اے سیلابِ اشکِ چشمِ تر بس — عناصر کی ہیں دیواریں پرانی

یہ دونوں ایک ہی ترکش کے ہیں تیر — محبت اور مرگِ ناگہانی

پیمبر گر پڑے ہیں تلملا کر — معاذ اللہ خدنگِ لن ترانی

سبک سر ہے عدو، روٹھا بلا سے — حبابوں کی بھلا کیا سرگرانی

انا الحق اور مُشتِ خاکِ منصور — ضرور اپنی حقیقت اس نے جانی

بقا جس شے کو ہو وہ چاہتا ہوں — سُن اے تیرے سوا سب کچھ ہے فانی

---

[1] اس کو

کمالِ جلوہ ہے پردے سے بڑھ کر — بجا ہے یار تیری لن ترانی
علم کر خلد میں بھی خنجرِ ناز — تصدق ہے حیاتِ جاودانی
دلِ شوریدہ اور ان سے مکدّر — ق — کہاں تک کہیئے اسرارِ نہانی
ہزاروں حسرتیں اس میں بھری تھیں — غبار اس قافلے کی ہے نشانی
سیاہی[1] کچھ جو بالوں میں ہے باقی — بڑھاپے میں ہے یہ داغِ جوانی

بھلا آسی[2] کے شکووں کا گِلا کیا
محبت کو ہے لازم بدگمانی

---

[1] سیاہی بالوں میں جو رہ گئی ہے [2] سے

۷۲

خاک کیا کم ہے اصلِ طینت کی
دل میں کیوں پوٹ ہو کدورت کی

خوفِ دوزخ نہ حرص جنّت کی
بے غرض میں نے تجھ سے اُلفت کی

ابدی نعمتیں ہیں جنّت کی
انتہا ہے تری عنایت کی

واہ رے اُلفت اپنی اُمّت کی
مجھ سے بے کس کی بھی شفاعت کی

نہ کھُلی کچھ حقیقتِ معراج
رہی پردے میں بات خلوت کی

خاکِ پائے علیؓ ہوا اے دل
یہ ہوا اوجِ بامِ رفعت کی

بھری محفل میں بے نقاب اے دوست
حشر تم نے کیا، قیامت کی

تجھ سے مل کر جو پھر بھی میں ہی رہا
مجھ سے دشمن نے کیوں محبّت کی

کیوں نہ مٹ جاتے جستجو میں ہم
تھا وہ کسوت میں اپنی صورت کی

پھر بھی ہم تم جُدا جُدا ٹھہرے
وصل میں بھی ادا ہے فرقت کی

میری حالت کے دیکھنے والے
مرتے ہیں آرزو میں رویت کی

یہ طریقِ جنوں مرا اے شیخ
راہ ہے کوچۂ سلامت کی

نہ ہوا جو وطن سے آوارہ
بُو نہیں اس میں آدمیت کی

پھر کہو گے کہ ہم نہیں بے رحم
آج دشمن نے بھی شکایت کی

یا خدا اب تو جانِ زار کی خیر
آج پھر دردِ دل نے شدّت کی

وہ سوادِ شبِ لحد دیکھو
ہو چلی شام روزِ فرقت کی

ہم نے مانا کہ شام ہے وہ زُلف
شام لیکن ہماری شامت کی

روح فرسا شباب کا غم ہے
کہ جوانی میں اُس نے رحلت کی

ہم سے بے کل سے وعدۂ فردا | بات کرتے ہو تم قیامت کی
حشر میں کون پوچھتا ہے کسے | قہر ہے دید خوب صورت کی
عشق کا روگ ہے محبّت خیز | غیر نے بھی مری نصیحت کی
نہ دیئے ہوں گے غیر کو بوسے | پر طبیعت تو ہے مروّت کی
دیکھو دل پر کوئی سپر رکھ لو | یہ نگاہیں ہیں چشمِ حسرت کی
سجدۂ آستانِ جاناں میں | خانۂ کعبہ نے امامت کی
خوب گہرا لگا ہے دل میں گھاؤ | بارے حسرت مٹی فراغت کی
شبِ وصل و نگار و ہوش و حواس | صبح ہے آج سب کی رخصت کی
ان کے جور و جفا کے شکوے کیا | یہی سیرت ہے حُسنِ صورت کی
تم کہو گے فلک رقیب نہیں | وجہ مجھ سے کوئی عداوت کی
دیکھئے ٹوٹتا ہے دَم کہ نہیں | آزمائش ہے آج طاقت کی

نہ غزل ہے نہ اس میں عرضِ ہنر
بڑ ہے آسیؔ یہ جوشِ وحشت کی

(۷۳)

جو رہی اور کوئی دم یہی حالت دل کی
آج ہے پہلوئے غم ناک سے رخصت دل کی

کیا لکھے عاشقِ بے تاب مصیبت دل کی
جی بگڑتا ہے جو لکھتا ہے عبارت دل کی

نہیں ممکن ہے لٹیروں سے حفاظت دل کی
پھیر آؤں انہیں چل کر میں امانت دل کی

مہندی مل کر مرے سینے کو نہ پامال کیا
دل کی طرح آج لہو ہوگئی حسرت دل کی

گھر چھٹا، شہر چھٹا، کوچۂ دل دار چھٹا
کوہ و صحرا میں لیے پھرتی ہے وحشت دل کی

سرِ عارف طرفِ دل ہی[1] جھکا رہتا ہے
ہے مگر خاکِ درِ یار سے خلقت دل کی

غمِ دل دار ہے خواہاں تو حوالے کر دے
تجھ کو اے عاشقِ بے تاب ضرورت دل کی

آ گئے وہ کہ پڑی جان دلِ بے جاں میں
اُٹھ چلے وہ کہ اِدھر ہو گئی رخصت دل کی

دل کی تاثیر سے سب کچھ ہے یہاں ہو کہ وہاں
دونوں عالم میں سمجھتا ہوں ولایت دل کی

جو اُڑا ذرہ دلِ زار کسی کا نکلا
کوئے دل بر میں نظر آئی یہ کثرت دل کی

ہو گیا نافِ سویدا کرۂ چرخِ کبود
سینۂ تنگ میں اللہ یہ وسعت دل کی

کعبہ ہو ابروؤں کا اور محبت کی نماز
اقتدا عاشقِ بے دل کی، امامت دل کی

کس طرح صورتِ منصور انا الحق نہ کہے
دارِ دنیا میں سمجھ لے جو حقیقت دل کی

باغ کو عاشقِ دل گیر نے سمجھا دل دار
غنچۂ گل میں نظر آئی جو صورت دل کی

دل دیا جس نے کسی کو وہ ہوا صاحبِ دل
ہاتھ آ جاتی ہے کھو دینے سے نعمت دل کی

جس سے پیوند کیا پائی شکستِ خاطر
ہائے تقدیر یہ پھوٹی ہوئی قسمت دل کی

---

[1] نسخہ: جو

کوچۂ یار سے گھبرا کے نکلنا کیا تھا
دل کو شکوے ہیں مرے، مجھ کو شکایت دل کی

خرد و تاب و تواں سے کبھو مِل کر رولیں
پہلوئے عاشقِ بےکس سے ہے رخصت دل کی

پہلوئے عاشقِ بے دل میں بس اِک آبلہ ہے
اُن کو کیا کہیے جو رکھ دیتے ہیں تہمت دل کی

اب کسی یار سے مطلب ہے نہ اغیار سے کام
کنجِ عزلت میں رہا کرتی ہے صحبت دل کی

یوں وہ بے دید کسی طرح نہیں ماننے کا
چل کے آنکھوں سے دکھادوں اسے حالت دل کی

دل کو چھیدے ہوئے نکلا جو کہیں تیر ترا
دل کے ساتھ آج نکل جائے گی حسرت دل کی

تم گلستانِ جہاں میں گلِ یک رنگ ملے
کان لاؤ تو سنا دوں میں حکایت دل کی

نقد و جنسِ خرد و صبر و سکوں کچھ بھی نہیں
لُٹ گیا عاشقِ دل گیر بدولت دل کی

دونوں پہلو گئے سنسان غمِ دل بر نے
اب نہ بہتان جگر کا ہے نہ تہمت دل کی

شبِ ہجر اُس کے تصور کو جگہ دوں کس میں
بے دلی میں کبھی پڑ جاتی ہے حاجت دل کی

دیکھ لیتے تھے اسی طرح کسی کو اُس میں
آئینہ دیکھ کے یاد آتی ہے صورت دل کی

دیکھئے آنکھوں میں جالے پڑے روتے روتے
خوب چھن چھن کے نکلتی ہے کدورت دل کی

مُنہ خفا ہو کے بنا لیتے ہو اتنے کے لیے
ایک بوسے میں نکل جائے گی حسرت دل کی

راستا چھوڑ دیا اُس نے اُدھر کا آسیؔ
کیوں بنی رہ گزرِ یار میں تربت دل کی

(۷۴)

حرصِ دولت کی نہ عزّ و جاہ کی
بس تمنّا ہے دلِ آگاہ کی

دردِ دل کتنا پسند آیا اُسے
میں نے جب کی آہ اُس نے واہ کی

کھنچ گئے کنعاں سے یوسف مصر کو
پوچھئے حضرت سے قوّت چاہ کی

بس سلوک اُس کا ہے منزل اُس کی ہے
اُس کے دل تک جس نے اپنی راہ کی

واعظو! کیسا بتوں کا گھورنا
کچھ خبر ہے ثَمَّ وَجْہُ اللّٰہ کی

کس کی حسرت نے جگایا تھا ہمیں
نیند[1] سوئے قبر میں نوشاہ کی

مجھ سے مجرم کے لیے خُلدِ بریں
مہربانی ہے رسُول اللہؐ کی

یاد آئی طاقِ بیت اللہ میں
بیتِ ابرو اُس بُتِ دل خواہ کی

راہِ حق کی ہے اگر[2] آسی تلاش
خاکِ رہ ہو مردِ حق آگاہ کی

---

[1] نمکنومتہ العروس نوٹ: ایک بیاض میں یہ شعر بھی نظر پڑا ہے
جب بڑھایا دستِ بیعت شیخ نے ٭ پھر گئی آنکھوں میں شکل اللہ کی [2] تلاش آسی اگر

(۷۵)

الٰہی بندھ رہی ہے آج گلشن میں ہوا کس کی
لیے پھرتی ہے خوشبو دم بدم بادِ صبا کس کی

ہوئی ہے اس طرح سے بے اثر یارب دُعا کس کی
پھر آتی ہے فلک سے جا کے آہِ نارسا کس کی

لُٹا جاتا ہے دل اور آج لہروں پر یہ لہریں ہیں
جگر میں بن کے ناگن ڈستی ہے زلفِ دوتا کس کی

کیا وار اُس نے غیروں پر مرے ہم رشک کے مارے
تماشا ہے الٰہی لگ گئی کس کو قضا کس کی

کہاں ممکن ہے کس سے انتظارِ یار ہو مجھ سا
رہے گی پھر بھی یوں ہی مثلِ[1] نرگس آنکھ وا کس کی

تہ و بالا ہوا جاتا ہے دل پہلو میں کیا باعث
چلا آتا ہے کون، آتی ہے گھنگرو کی صدا کس کی

لڑیں زلفوں سے آنکھیں اور دل کی شامتیں آئیں
پڑی ہے یا الٰہی کس کے سر جا کر بلا کس کی

خفا صیّاد ہے، چیں بر جبیں گل چیں ہے کیا باعث
بُرا کس کا کیا، تقصیر کی ہم نے بھلا کس کی

---

[1] آئی

صدا تک بھی نہ دی میرے دہانِ زخم نے، ہے ہے
نہ پوچھو گڑ گئی ہم میں نگاہِ سُرمہ سا کس کی

ہمارا خون کرتے ہیں کہ مہندی ہی وہ ملتے ہیں
تمنّا آج بَر لاتا ہے دیکھیں تو خدا کس کی

تہہِ عرشِ معلّٰی کچھ دھواں سا آج اٹھتا ہے
خدا جانے لگا آئی ہے آگ آہِ رسا کس کی

ہمارا بند بند اس طرح کٹوانا نہ لازم تھا
چھُوا تھا بند کس کا ہم نے کھولی تھی قبا کس کی

جدھر چلتا ہے اے جلّاد بسمل اُس کو کرتا ہے
اُڑائی ہے ترے خنجر نے چلنے کی[۱] ادا کس کی

عجب حسرت سے آسیؔ کہہ رہا تھا کل مدینے میں
شفاعت ہو گی پہلے حشر میں یا مصطفٰیؐ کس کی

---

[۱] میں

(۷۶)

وہ اور جُدا ہم سے یہ تقدیر ہماری — کچھ اُن کی خطا اس میں نہ تقصیر ہماری

کیا جانو بھلا گلشنِ ہستی کی حقیقت — اس گل سے ہے ملتی ہوئی تصویر ہماری

کیوں بھیجیں وہ جنت میں ہمیں اپنی گلی سے — ہاں کوئی خطا قابلِ تعزیر ہماری

جو حلقہ ہے حلقہ ہے وہ پاکانِ ازل کا — آزادئ کونین ہے زنجیر ہماری

اعمال کی پرسش تجھے ہم کو یہ تفحص — رحمت تری بڑھ کر ہے کہ تقصیر ہماری

تم کیا ہوئے قابو میں کہ قابو میں ہم آئے — تسخیر تمہاری ہوئی تسخیر ہماری

آئے وہ مرے گھر کششِ جوشِ جنوں سے — اللہ رے یہ خوبئ تقدیر ہماری

تدبیر یہ نکلی کہ انہیں پھانس کے لائے — ہنستی رہی تقدیر کو تدبیر ہماری

شاگرد ہے کس کا فلکِ پیرِ ستم میں — گردش میں تو استاد ہے تقدیر ہماری

صورت میں پڑے جان جو اچھا ہو مصوّر — سنتے ہو جسے قیس، ہے تصویر ہماری

دنیا میں اٹھا لائی ہے فردوسِ بریں کو — بدمستئ صہبا و مزامیر ہماری

ہرگز حرکت اپنے ارادے سے نہ کرنا — چلتے ہیں تو چلاتی ہے زنجیر ہماری

پہچان لیا جلوہ گرِ خانۂ دل کو — آئینۂ معمار ہے تعمیر ہماری

وعدے کئے اس شوخ نے آنے کے شبِ غم — اب دیکھئے کیا کرتی ہے تقدیر ہماری

آسیؔ اگر ادراکِ حقیقت ہو میسّر
ہے انفس و آفاق میں تاثیر ہماری

(۷۷)

آہ بھی آج ہے اک ہم سفرِ اشکِ نئی
کیا ملی سوئے فلک رہ گزرِ اشکِ نئی

نوُر افشاں ہے دمِ گریہ کسی کا تو خیال
نظر آتی ہے ضیائے گہُرِ اشکِ نئی

گوہرِ گوشِ قبول اُس نے بنایا آخر
ہاتفِ غیب نے دی یہ خبرِ اشکِ نئی

آج تو گریۂ عاشق نے کیے دل ٹکڑے
ہاتھ آئی کوئی تیغِ اثرِ اشکِ نئی

کوششِ دستِ مژہ نے اسے کب روکا تھا
آج ہے طرزِ گرفتِ کمرِ اشکِ نئی

میلِ پرواز سوئے اوجِ فلک رسمِ کہُن
ہمّتِ طائرِ بے بال و پرِ اشکِ نئی

توڑ اُس میں بھی ہوا تیرِ دُعا کا آخر
اب تو اے چرخِ کہن اک سپرِ اشکِ نئی

تیرے آنسو بھی ہوئے خشک میں خونابہ فشاں
شاید اے شمع ہے میری سحرِ اشکِ نئی

سیل وطوفاں جو کہا تو نے تو کیا خاک کہا
کچھ نئی بات ہو اے مدح گرِ اشکِ نئی

رشکِ فوّارہ ہے بے تابئِ جوشِ رقّت
اے جنوں ہے یہ بہارِ شجرِ اشکِ نئی

تیرے پرَتو سے ہے جب رشکِ قمر ہر قطرہ
ٹھیک ہے بندشِ نوُرِ قمرِ اشکِ نئی

رات دن مجھ کو تو کرتی ہی رہی تر دامن
اُن کے دامن کی طرف ہے نظرِ اشکِ نئی

ثمرِ اشکِ غمِ عشق تو تھا تیرا رحم
جھڑکیاں دیتی ہیں بوئے ثمرِ اشکِ نئی

محوِ عشقِ دُرِ دنداں کی علامت کیا ہے
رونے میں ہوتی ہے تابِ گہرِ اشکِ نئی

بارہا معرکے قلزم سے ہوئے فتح کے ساتھ
آج پھر جنگ ہو، پھر ہو ظفرِ اشکِ نئی

نہ کسی راہ سے پہنچا وہ کسی دامن تک
کوئی راہ آج ہو اے راہبرِ اشکِ نئی

برقِ ہستی ہے پئے غیر سرشکِ آسیؔ
کچھ تو بات اس میں ہے اے بے خبرِ اشکِ نئی

(۷۸)

اے جنوں پھر مرے سر پر وہی شامت آئی
پھر پھنسا زلفوں میں دل پھر وہی آفت آئی

مر کے بھی جذبِ دلِ قیس میں تاثیر یہ تھی
خاک اڑاتی ہوئی لیلےٰ سرِ تربت آئی

مسجدیں شہر کی اے پیرِ مغاں خالی ہیں
مے کدے میں تو جماعت کی جماعت آئی

وہ ہے کھڑکی میں، اُدھر بھیڑ نظر بازوں کی
آج اُس کوچہ میں سُنتے ہیں قیامت آئی

کبھی جی بھر کے وطن میں نہ رہے ہم آسیؔ
روزِ میلاد سے تقدیر میں غربت آئی

۷۹

اس چاہ سے در گزرے، یہ اُلفت نہیں اچھّی
منہ دیکھے کی اے جان محبّت نہیں اچھّی

ہم تو یہ کہے جائیں گے اے گیسوئے جاناں
عاشق سے اُلجھ پڑنے کی عادت نہیں اچھّی

اُس طفلِ برہمن سے جو کی وصل کی خواہش
کچھ گن کے وہ بولا ابھی ساعت نہیں اچھّی

آسیؔ نے جو اُس شوخ کو کل گھور کے دیکھا
چتون یہ پکار اُٹھّی کہ نیت نہیں اچھّی

(۸۰)

آئینہ آپ کے نزدیک جو نامحرم ہے ‏— آپ نے خاک نہ جانا کہ مجھے کیا غم ہے

مار ڈالو بھی کسی دن تو نہ دعویٰ نہ گواہ ‏— بے خودی ہے کوئی مونس نہ کوئی ہمدم ہے

دیکھتے ہو جگر و دل کے لہو کا سہرا ‏— علمِ نالۂ بے داد میں کیا پرچم ہے

میرے دشمن کو نہ مجھ پر کبھی قابو دینا ‏— تم نے منہ پھیر لیا آہ یہی کیا کم ہے

جز ترے کچھ نہیں موجود، تری ذات ہے وہ ‏— جا بجا تو نظر آتا ہے یہی عالم ہے

جو اُڑی خاکِ قدم جان پڑی اُس میں ضرور ‏— کیا ہوا جنبشِ دامن کی مسیحا دم ہے

وصل کی شب درو دیوار سے آئی آواز ‏— خواہشوں کو جو پچھاڑے وہ بڑا رستم ہے

ایک عالم کے طلسمات میں جی چھوٹ گیا ‏— ہر ادائے نگہِ یار نیا عالم ہے

کیوں نہ دی جان کسی پر کہ نہ پھر موت آتی ‏— زندگی مفت گنوائی یہ بڑا ماتم ہے

ہائے کیا بوجھ بڑھاپے میں بھرا تھا اللہ ‏— سر تو سینے میں گھسا پیٹھ کمر تک خم ہے

تو نے کیا ذکر کہاں آکے نکالا واعظ! ‏— یہ وہ کوچہ ہے کہ جس میں غمِ جنت سم ہے

چاکِ دل ہے غمِ عالم نظرِ یار رفو ‏— زخمِ کاری ہے غمِ عشق، فنا مرہم ہے

قالبِ نظم میں جو پھونک دے جان اے آسیؔ

نہ وہ عیسیٰ ہیں نہ موسیٰ، وہ ہمارا دم ہے

نوٹ: ایک بیاض میں یہ شعر موجود ہے۔ ؎ عشق کہتا ہے کہ عالم سے جدا ہو جاؤ ÷ حسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے

(۸۱)

عہدِ شباب عہدِ وفائے نگار ہے — کتنا ہی پائدار ہو ناپائدار ہے

کیوں[1] تجھ کو اس قدر غمِ روزِ شمار ہے — اے محتسب شراب بڑی غم گسار ہے

جنّت نہیں ہے پرتوِ روئے نگار ہے — طوبیٰ نہ کہیئے سایۂ بالائے یار ہے

صیّاد و عندلیب میں کیا واقعہ ہوا — گل دل فگار، سُنبلِ تر سوگوار ہے

فانی ہے گردشِ فلکی بھی ہمارے ساتھ — ساری ہمیں سے دشمنیِ روزگار ہے

خوں ریز توبہ، زہد شکن، اتقا گداز — شام آپ کے شباب کی صبحِ بہار ہے

ایذا نویدِ مقدمِ راحت ہے، صبر کر — جوشِ بہارِ گل کششِ نوکِ خار ہے

کیا چیز تیری نذر کریں[2] اے رسولِ یار — اپنی تو زندگی بھی یہاں مستعار ہے

جوشِ سرشک اور ہوا کوئے زلف کی — ایک ایک قطرہ نافۂ مُشکِ تتار ہے

عشق و ہوس میں حُسن کو تمیز چاہیئے — مانو نہ مانو آگے تمہیں اختیار ہے

ذرّہ بھی روشنی نہیں نرگس کی آنکھ میں — یہ بھی مگر ستم زدۂ انتظار ہے

ہستی ہے عین موجۂ دریائے نیستی — درکار قوتِ نگہِ اعتبار ہے

وقتِ اخیر اگر نہ بندھا غیر کا خیال — کُنجِ لحد ہمیں چمنِ کوئے یار ہے

بنیادِ روزگار کی نا محکمی نہ پوچھ — گنبد حباب کا تو بہت اُستوار ہے

سودائے ذوقِ جلوہ عبث جب نظر نہیں — جلوہ تو بہرِ اہلِ نظر بے قرار ہے

واعظ[3] مرا معاملہ میرے خدا کو سونپ — بندہ گناہ گار، وہ آمرزگار ہے

---

[1] تجھ کو بھی کس قدر [2] کروں [3] واعظ تو مجھ کو چھوڑ دے میرے خدا کے ساتھ

یہ بات وہ ہے جس کو مرے دل سے پوچھئے — عشق مژہ میں بھی خلش نوکِ خار ہے

ذوقِ ادا و ناز کہاں بے خودی کہاں — اب تو شرابِ وصل بھی کچھ ناگوار ہے

بہرِ زیارت[1] آئے ترا تیر کیوں نہ ہو — حسرت شہیدِ یاس، دل اُس کا مزار ہے

لو اب تو مُرغِ جاں نہیں ممکن کہ اُڑ سکے — تیرِ نگاہِ ناز کلیجے کے پار ہے

کثرت میں اور کیا ہے جو وحدت نہ مانئے — ہر ایک ایک۔ ایک ہے، سو یا ہزار ہے

پیری میں حرصِ شاہد دمے ہو گئی جوان — اپنی خزاں بھی موسمِ جوشِ بہار ہے

مستی میں کوئی راز جو آسیؔ سے فاش ہو
معذور ہے ابھی کہ نیا بادہ خوار ہے

---

[1] اذنِ زیارت اپنے خدنگِ نظر کو دو

(۸۴)

کہتے ہو جانِ زار کو یہ مُستعار ہے
دل پیش کش کروں تو کہو داغ دار ہے
میدانِ رستخیز بڑا[1] فتنہ زار ہے
وعدہ وہاں وفا ہو کسے اعتبار ہے
کس روز ایک رنگ پر اُس کو قرار ہے
عاشق کی زیست ہم نفسِ روزگار ہے
سیلِ بنائے ہستیٔ بُلبل نہ ہو کہیں
تیغِ ادائے جلوۂ گل آب دار ہے
کیا جال ہے ہماری گہر باریٔ مژہ
جوش و خروشِ ہمتِ دریا شکار ہے
اے شمع ایک شعلہ نے تجھ کو کیا تمام
ہر قطرۂ سرشک یہاں شعلہ زار ہے
کیوں منہ لگاؤ غیر کو اتنا کہ سر دُکھے
ہم جانتے تھے نشۂ مے کا خمار ہے
مانندِ آہ قبۂ گردوں سے چل نکل
ناحق اسیرِ کشمکشِ روزگار ہے
بلبل خزاں میں بھی کہیں کرتی تھی چہچہے
خونِ جگر سے آہ مرے[2] گل عذار ہے

---

[1] کراک [2] کوئی

دریائے آتش آنکھوں سے اُمڈے تو جانئے
مانا کہ ابر بھی ہمہ تن اشک بار ہے
دشمن کو فکر کیوں مری صحت کی پڑ گئی
اے دردِ عشق اب تو ترا اعتبار ہے
امساکِ بوسہ جھوٹ، غلط، افترا سہی
بات[1] اتنی ہے کہ حسن کفایت شعار ہے
گورِ سیہ سے خوف تو واعظ کو چاہیئے
پابندِ زلف عاشقِ شب ہائے تار ہے
دونوں[2] ہوں کامیاب وہ پہلو نکالئے
دل اُس طرف، جگر اِدھر امیدوار ہے
دامِ فنائے ہستیِ موہوم واہ وا
عنقائے وصلِ یار ضرور اب شکار ہے
مے خانے میں وہ آئے جو اُترے فنا کے گھاٹ
شمشیرِ موجِ بادہ بہت آب دار ہے
کیوں کر ہوائے ل کے جھونکوں میں اُڑ نہ جائے
ہستی تو کاروانِ نفس کا غبار ہے
شعر اور سرِ غیب یقیناً یہ میں نہیں
روح القدس ہے یا کرمِ کردگار ہے
اے رخشِ عمر تو نے گڑھے میں گرا دیا
آسیؔ کو سنتے تھے کہ بڑا شہ سوار ہے

---

[1] بحث [2] پیکانِ یار دیکھئے کس پر کرم کرے

(۸۴)

آنکھیں پائی ہیں غمِ اُلفت میں رونے کے لیے
آستینیں ہاتھ آئی ہیں بھگونے کے لیے

گلشنِ ہستی میں شکلِ غنچۂ گل یا نصیب
آئے ہم خستہ جگر دل چاک ہونے کے لیے

آنکھ سے جب منہ پر آیا اشکِ غم، کہنے لگا
آبرو ہے آشنائی میں ڈبونے کے لیے

پھولنے پھلنے سے کیا واقف جو سبزے کی طرح
اس چمن میں ہے فقط پامال ہونے کے لیے

سوزشِ غم سے ہم اس محفل میں ہیں مانندِ شمع
جلنے گھلنے سر کے دُھننے اور رونے کے لیے

دولتِ ہوش و خرد یا نقدِ جاں یا جنسِ دل
جو یہاں ہے وہ ترے سودے میں کھونے کے لیے

قطرہ ہائے اشکِ حسرت کو نہ لاحاصل کہو
مزرعِ اُمید میں دانے ہیں بونے کے لیے

تو بھی کیا آئی تھی اے شبنم یہاں میری طرح
ان گلوں سے مِل کے چُپکے چُپکے رونے کے لیے

اے فلک روشن دلوں سے آپ غفلت دُور ہے
کس ستارے کو ملی ہے آنکھ سونے کے لیے

جُز شبِ گور اب تو نیند آنا بہت دشوار ہے
بس وہی اک رات ہے فرقت میں سونے کے لیے

ایک سی ہیں عاشق و معشوق کی آنکھیں مگر
ایک رونے کے لیے ہے ایک سونے کے لیے

قافلہ منزل کو جا پہونچا مگر مثلِ غبار
رہ گئے ہیں ایک ہم برباد ہونے کے لیے

کیا بتاؤں کس لیے ہے یہ وفورِ آبِ اشک
دامنِ دل میں ہیں دھبے اُن کے دھونے کے لیے

دم جو ٹوٹا عاشقِ بیمار کا آئی صدا
ہائے کیا اُن سے ملے تھے جان کھونے کے لیے

زندگی کا ہے بکھیڑا جو تکلف ہے یہاں
قبر میں حاجت نہیں تکیئے بچھونے کے لیے

صبح دم دم توڑتی تھی اور یہ کہتی تھی شمع
ہائے اس محفل میں ہم آئے تھے رونے کے لیے

رنج و غم کے واسطے اسباب کی حاجت نہیں
آنکھ کب درکار ہے شبنم کو رونے کے لیے

اشک[1] ریزی ہم کریں تم خندۂ دنداں نما
حضرتِ عشق آئے ہیں موتی پرونے کے لیے

پھول سا پایا ہے مُنہ جس پر جگر ہیں چاک چاک
خارِ مژگاں پائے ہیں دل میں چبھونے کے لیے

پلکیں ملتا ہوں جو قدموں سے تو فرماتے ہیں کیا
کانٹے لایا میرے تلووں میں چبھونے کے لیے

اُس لُٹیرے کی گلی میں ہم بھی آسیؔ کی طرح
نقدِ جاں سی چیز لے جاتے ہیں کھونے کے لیے

[1] ایک بیاض میں یہ تین اشعار بھی پائے گئے۔

(۸۴)

سارے عالم میں تیری خوشبو ہے　　اے میرے رشکِ گل کہاں تو ہے

ہو گیا دائم[۱] خوف و غم سے رہا　　جو تمہارا اسیرِ گیسو ہے

مصحفِ روئے یار جانی پر　　قابض افسوس خالِ ہندو ہے

نظمِ عالم کہ لا جواب لہٗ　　فرد اس میں وہ بیتِ ابرو ہے

برچھی تھی وہ نگاہ دیکھو تو　　لہو آنکھوں میں ہے کہ آنسو ہے

ایک دم میں ہزار دفتر طے　　چشمِ حسرت غضب[۲] سخن گو ہے

تو ہی تو اور بال بال اپنا　　فاختہ اور شورِ کوکو ہے

تجھ کو دیکھے پھر آپ میں رہ جائے　　دل پر اتنا کسی کو قابو ہے

جوشِ اشک و تصورِ قدِ یار　　سرو گویا کھڑا لبِ جو ہے

حد نہ پوچھو ہماری وحشت کی　　دل میں ہر داغ چشمِ آہو ہے

جس نے مومن بنا لیا[۳] ہم کو　　وہ تمہارا ہی مصحفِ رو ہے

جس[۴] کے کشتے ہیں زندۂ جاوید　　وہ تمہاری ہی تیغِ ابرو ہے

دل جو بے مدعا ہو کیا کہنا　　یہی ویرانہ عالمِ ہو ہے

پُل بھی ہے فخرِ جون پور آسیؔ

خواب گاہِ جنابِ شیخو[۵] ہے

---

[۱] بند [۲] عجب [۳] بنا دیا مجھ کو [۴] جس کے کشتوں سے بھاگتی ہے موت [۵] ملاحظہ ہو ص۲۳۔

(۸۵)

اڑا کر رکھ دیئے پُرزے جگر کے
اجی بل جائیے تیغِ نظر کے

یہ حالت ہو گئی زلفوں میں پھنس کر
کہ اب مہمان ہیں ہم رات بھر کے

خدا حافظ ہے[۱] اس گل کی کمر کا
غضب جھونکے چلے بادِ سحر کے

نہ تم نے قدر کچھ عاشق کی جانی
بہت روؤ گے اک دن یاد کر کے

اجی دل میں اُتر آؤ کسی دن
مری آنکھوں پر اپنے پاؤں دھر کے

دمِ آخر تو سینے سے لپٹ جا
کوئی جیتا نہیں اے جان مر کے

لحد میں تم[۲] نہ چھیڑو اے فرشتو
ستائے ہیں کسی کے عمر بھر کے

نہ جب تک اُس کو چھاتی سے لگایا
غضب صدمے رہے دردِ جگر کے

بنے آنسو پھپھولے صورتِ شمع
جلائے ہیں ہم اپنی چشمِ تر کے

برنگِ شمع ٹھنڈا بھی کرا نے صبح
جلائے ہیں کسی کے رات بھر کے

غمِ دنداں میں وہ لاغر ہوئے ہم
کہ ہیں تارِ نظر چشمِ گہر کے

خدا حافظ ترے بیمار[۳] کا ہے
کہ اب غش آتے ہیں دو دو پہر کے

کہیں دل یا جگر جلنے لگے گا
نہ سنئے میری آہیں کان دھر کے

دمِ آخر دیئے اُس بُت نے بوسے
وہ بوسے تھے کہ تھے توشے سفر کے

کہیں پھر چوٹ کھائی تم نے آسیؔ
بہت[۴] روتے ہو دل پر ہاتھ دھر کے

---

[۱] اب [۲] اب [۳] بیمارِ غم کا [۴] کہ روتے ہو جگر پر۔

(۸۶)

وہ کیا ہے ترا جس میں جلوا نہیں ہے
نہ دیکھے تجھے کوئی اندھا نہیں ہے

یہاں کیوں تم آؤ تماشا نہیں ہے
ہجومِ غم و درد میلا نہیں ہے

کہاں دامنِ حُسن عاشق سے اٹکا
گلِ داغِ الفت میں کانٹا نہیں ہے

کیا ہے وہاں اس نے پیمانِ فردا
یہاں ہے وہ شب جس کو فردا نہیں ہے

وہ کہتے ہیں میں زندگانی ہوں تیری
یہ سچ ہے تو اُن کا بھروسا نہیں ہے

دکھاتا ہے کیوں آئینہ قلبِ صافی
تصوّر کسی کا ہے سکتا نہیں ہے

مری زیست کیوں کر نہ ہو جاودانی
جو مرتا ہے اس پر وہ مرتا نہیں ہے

بھلا یارِ دل سوز ملتا ہے کس کو
جلایا دل اس نے تو شکوا نہیں ہے

وہی خاک اڑانا، وہی گردشیں ہیں
یہ مانا کہ عاشق بگولا نہیں ہے

گلوگیر ہے ان بھوؤں کا تصوّر
گریبان میں اپنے کنٹھا نہیں ہے

انؔ آنکھوں کو جب سے بصارت ملی ہے
سوا تیرے کچھ میں نے دیکھا نہیں ہے

سمجھتے ہو جوشِ انا الحق کی موجیں
وہ قطرہ نہیں ہے جو دریا نہیں ہے

مری حسرتیں اس قدر بھر گئی ہیں
کہ اب تیرے کوچے میں رستا نہیں ہے

وہ دل کیا جو دل بر کی صورت نہ پکڑے
وہ مجنوں نہیں ہے جو لیلا نہیں ہے

دل و دین و جاں دے کے وہ ایک بوسہ
اگر ہاتھ آئے تو مہنگا نہیں ہے

کمالِ ظہورِ تجلّی سے جانا
جو پنہاں نہیں ہے وہ پیدا نہیں ہے

---

[۱] بصارت ملی ہے ان آنکھوں کو جب سے،

بھرے جائے زنداں میں موتی خدا نے
دہانِ صنم ہے یہ غنچا نہیں ہے

اسیروں سے اپنے اُلجھنا، بگڑنا
یہ کیا ہے جو زلفوں کو سودا نہیں ہے

تیری راہ میں کوئی کیوں کر نہ سر دے
یہ دینا تو لینا ہے دینا نہیں ہے

ہجومِ الم ہے نہ گھونگھٹ اُٹھاؤ
کہ عاشق تمہارا اکیلا نہیں ہے

مگر سر کے بل چلتے ہیں اس گلی میں
نشانِ قدم کوئی پیدا نہیں ہے

وہ رہرو ہوں میں صورتِ نکہتِ گل
جسے خارِ رہ کا بھی کھٹکا نہیں ہے

عدو کیوں اُلجھتے ہیں اے رشکِ گلشن
ترا عاشقِ زار کانٹا نہیں ہے

ہر اک طالبِ دیں ہے طالب فنا کا
کہ جب ہم نہیں آپ دنیا نہیں ہے

نکل جائے دم اسؔ کی اُلفت میں آسیؔ
سوا اس کے اب کچھ تمنا نہیں ہے

لہ ان کے قدموں کے نیچے۔

(۸۷)

روش اُس چال میں تلوار کی ہے — موت عُشّاقِ گنہگار کی ہے
گل و گلشن سے کبھی جی نہ لگائے — یہ صدا مُرغِ گرفتار کی ہے
ہائے وہ ہم نفسانِ گلشن — یہ صدا مُرغِ گرفتار کی ہے
ہائے وہ گلبن و گلشن کی بہار — یہ صدا مُرغِ گرفتار کی ہے
رشکِ گلشن ہو الٰہی یہ قفس — یہ صدا مُرغِ گرفتار کی ہے
نکہتِ گل نہ صبا بھی لائی — یہ صدا مُرغِ گرفتار کی ہے
آکے بے پردہ ملیں وہ دمِ نزع — یہ دُعا عاشقِ بیمار کی ہے
دل[۱] کی قیمت کو ہیں[۲] کونین بھی کم — ہمّت اب اس میں خریدار کی ہے
پیشِ محراب نہ کیوں سجدے ہوں — صورت اُس ابروئے خم دار کی ہے
چال[۳] وہ چل کہ نہ ہو محشر خیز — یہ روش چرخِ جفا کار کی ہے
مجھ کو ہنگامۂ محشر سے غرض — بس تمنّا ترے دیدار کی ہے
سر بلندوں کو ہے جھکنا لازم — یہ صدا گنبدِ دوّار کی ہے
چار یارانِ نبی میں آسیؔ — ق — تبعیّت مجھے ہر یار کی ہے

طلبِ راہِ خدا میں لیکن
پیروی حیدرِ کرّار کی ہے

---

۱ دلِ عاشق کی بھلا قیمت کیا ٭ اس میں ہمّت ہی خریدار کی ہے ۲ سے
۳ وہ نہ چل چال کہ ہو محشر خیز

۸۸

زخمی ہوئے آسی کہیں پھر تیرِ[1] نظر سے
گرتا ہے لہو آنسوؤں میں دیدۂ تر سے

رومال بھی سرکاؤ کہیں دیدۂ تر سے
اشکوں میں نظر آتے ہیں کچھ لختِ جگر سے

اب حاجتِ روزن نہ غرض رخنۂ در سے
منہ اس نے نکالا ہے یہاں چاکِ جگر سے

وہ نقدِ دلِ زار مرا پھیر کے بولے
یہ قلب ہے پرکھاؤ کسی اہلِ نظر سے

باطن سے نہیں راہ تو کیا دیدۂ ظاہر
آنکھ اپنی برابر نہ ہوئی چشمِ گہر سے

بے تابِ فنا جامۂ ہستی کو بنایا
تارِ نگہِ مضطربِ چشمِ شرر سے

آئینہ طبیعت ہیں مگر اہلِ صفا[2] بھی
بے ساعتِ دیدار نکلتے نہیں گھر سے

پھر حسرتِ پیکانِ نگہ اے دلِ ناداں
اب تک تو ٹپکتا ہے لہو زخمِ جگر سے

ظاہر میں تو کچھ چوٹ نہیں کھائی ہے ایسی
کیوں ہاتھ اٹھایا نہیں جاتا ہے جگر سے

شاہد ہیں مرے قول کے غنچے جو کھلے ہیں
ٹکڑے ہوئے دل نالۂ مرغانِ سحر سے

جس پر متوکل تھے یہاں وہ ہے وہاں بھی
فارغ دمِ رحلت ہیں غمِ زادِ سفر سے

بسمل ہوئی کیا حسرتِ دیدار کسی کی
خون آج ٹپکتا ہے تری تیغِ نظر سے

مرتا ہوں میں اُن پر تو وہ آزردہ ہیں سُن کر
کیوں رنج نہ ہو دوست کے مرنے کی خبر سے

برباد کیا جس سے جہاں آنکھ لڑائی
خاک اڑتی ہے عالم میں تری موجِ نظر سے

بادل[3] کی ضرورت نہیں کچھ صحبتِ مے میں
تیغِ نگہِ ساقیِ بدمست ہی برسے

پیشِ نگہِ یار ہرن ہو گئے آنسو
دریائے رواں باندھ دیا سحرِ نظر سے

---

۱ تیغ ۲ فنا ۳ ابر

ہے کلکِ گہر بار سے ثابت دمِ تحریر
جو شاخ ہے جھک جاتی ہے وہ بارِ ثمر سے

رگ رگ میں ہے جوشِ مئے سرجوشِ اناالحقؔ
دیکھا مجھے ساقی نے عجب مست نظر سے

اے آئینۂ منزلِ عکسِ رخِ جاناں
آنکھ اپنی بدل دے مرے اس دیدۂ تر سے

معدوم پریشاں نظری ہو کہیں باندھو
شیرازۂ اجزائے نگہ موئے کمر سے

آسیؔ اسی حسرت میں مرے اور جئے ہم
بے پردہ نظارہ ہو کہیں دیدۂ سر سے

(۸۹)

قطرے میں کچھ نہیں پانی کے سوا کیا کہیے
بات کہنے کی نہیں ہے بخدا کیا کہیے

لالہ و گل میں اُسی رشکِ چمن کی ہے بہار
باغ میں کون ہے اے بادِ صبا کیا کہیے

ہم کہاں، ہم تو ہیں معدُوم، مگر ہے کوئی
کہہ دیں کچھ صاف تو ہوتے ہو خفا' کیا کہیے

سب بدل سکتے ہیں یہ سمع و بصر، ہوش و خرد
میری سُنتے نہیں میرے رُفقا کیا کہیے

کعبہ جب گھر ہے تو بُت خانے میں ہونا[1] کیسا
اس کو[2] بے جا کہیں یا کہیے بجا کیا کہیے

ایک ہستی کے سوا کچھ بھی نہ جانا ہم نے
اے نکیرین پھر اور اس کے سوا کیا کہیے

آسیؔ خاک نشیں ہے تو سیہ کار ضرور
سگِ درگاہِ رشیدی[3] ہے بُرا کیا کہیے

---

۱ رہنا ۲ اس کو
۳ قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد رشید جونپوری صاحب مناظرہ رشیدیہ قدس سرہٗ

۹۰

رہِ ملکِ عدم کا نام سُن کر دم نکلتا ہے
یہ وہ رستا ہے جس میں ہر مسافر سر[1] سے چلتا ہے

نظر باز اُن کے گھر سے ہو کے متوالا نکلتا ہے
وہ جادو آنکھ کا مانندِ دورِ بادہ چلتا ہے

مگر تارِ نفس سوزِ دروں سے آج جلتا ہے
بسانِ شمع شعلہ سا مرے سر سے نکلتا ہے

غم اُس کا کیا خرامِ ناز ہے جو دل کو ملتا ہے
کلیجا کیا کوئی نالا ہے جو منہ سے نکلتا ہے

جوانی گو نہیں پر ناتوانی ہے ضعیفی کی
ملے جو کوئی چکنی وضع پائے دل پھسلتا ہے

بھویں تشبیہ سروِ بے ثمر کو قطع کرتی ہیں
نہالِ قد وہی تلوار کا پھل جس میں پھلتا ہے

ہوا تیری سمائی ہے جو اے ابرِ کرم سر میں
خوشی سے پھول کر کیا کیا حبابِ بحر اُچھلتا ہے

بسانِ شمع سوزِ غم میں کیا اخفائے گریہ ہو
گلے کا ہار ہو جاتا ہے جو آنسو نکلتا ہے

---

[1] مرکے

ہر اک داغِ جگر میں جگمگاہٹ ہے ستارے کی
مگر کاغذ کی صورت عاشقِ لاغر بھی جلتا ہے

پڑا ہے نقشِ پا کی طرح عاشق تیرے کوچے میں
نہ اُٹھتا ہے نہ ہلتا ہے نہ پھرتا ہے نہ چلتا ہے

رہا کرتا ہے جھرمٹ اُن کے قدموں پر نگاہوں کا
تنِ شفاف پر پائے نظر ایسا پھسلتا ہے

پرایا حق وہ تھا جاتا رہا جو ہاتھ سے اپنے
بسانِ آسیا ناحق کفِ افسوس ملتا ہے

ملایا خاک میں ناقدریوں نے اہلِ بینش کی
لہ جو مثلِ اشک آنکھوں سے گرا وہ کب سنبھلتا ہے

درختِ بارور کی طرح پتھر روز کھاتا ہوں
جنونِ نخلِ قدِ یار مجھ کو خوب پھلتا ہے

اگر شورِ شباب اتنا ہوا اس کا تکبّر کیا
گجر ہے دوپہر کا آفتابِ حُسن ڈھلتا ہے

بسانِ شمع آخر آپ رہ جاتا ہے جل بھُن کر
کہیں آتش زبانی سے کسی کا کام چلتا ہے

لہ جو اشک آنکھوں سے گرتا ہے بھلا وہ کب سنبھلتا ہے

مگر آتا ہے راہِ کوچۂ زلفِ معنبر سے
قبائے گل کو ہر جھونکا صبا کا عطر ملتا ہے

اُن آنکھوں کی قسم کچھ گرمیٔ دل کم نہیں ہوتی
خیالِ جُنبشِ مژگاں اگر پنکھا بھی جھلتا ہے

ملا وہ ماہ پیکر اپنی آغوشِ تمنا میں
مرا پائے طلب بھی صورتِ افلاک چلتا ہے

زمینِ شعر سے ہنگامِ وصفِ قامتِ جاناں
ہر اک مصراعِ موزوں سرو بن بن کر نکلتا ہے

غمِ دنداں میں مثلِ ابرِ نیساں ہیں مری آنکھیں
دُرِ نایاب بن جاتا ہے جو آنسو نکلتا ہے

بندھا ہے جس میں کچھ مضمون اپنی ناتوانی کا
بمشکل قافیہ اُس شعر کا پہلو بدلتا ہے

دمِ توصیفِ ابرو آسمانِ فکرِ آسیؔ پر
مہِ نو کی طرح ہر مصرعہ روشن نکلتا ہے

(۹۱)

کلامِ دردِ آگیں کی صفائی جان لیتی ہے
عروسِ فکرِ آسیؔ رونمائی جان لیتی ہے

دمِ نزعِ رواں اچھی طرح ثابت ہوا مجھ کو
فرشتہ بن کے بھی تیری جدائی جان لیتی ہے

جو عاشق ہے تو عالی ظرف ہو ورنہ حباب آسا
تنک ظرفوں کی آخر آشنائی جان لیتی ہے

کڑا کیا چوڑیاں بھی قالبِ بے جاں نظر آئیں
نہیں کہتے تھے ہم تیری کلائی جان لیتی ہے

زبانِ موج ہر پھر کر یہ کہتی ہے حبابوں سے
ہوا سرکش کے سر میں جب سمائی جان لیتی ہے

بسانِ شمع بہہ جاتا ہے سارا جسم گھل گھل کر
جنوں نے آگ جب سر میں لگائی جان لیتی ہے

مگر عمرِ رواں کی شان رفتہ رفتہ پیدا کی
کہ اُس سروِ رواں کی بے وفائی جان لیتی ہے

بجز عُشّاق، سم ہے بوسۂ خالِ رُخِ جاناں
کہ بے عادت جہاں افیون کھائی، جان لیتی ہے

بہت مشکل ہے جینا آدمی کو عاشقی کر کے
اجل جس وقت جس کے سر پر آئی، جان لیتی ہے

جگر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کے گر پڑتے ہیں آنکھوں سے
نگاہِ ناز کی تیغ آزمائی جان لیتی ہے

جو بڑاتا ہے سوتے میں بھی آسیؔ تو یہ کہتا ہے
الٰہی اب تو اُن کی پارسائی جان لیتی ہے

۹۲

ذوقِ افزائے جنوں ہے اشتیاقِ ہم مجھے / دل مرا درکار اُس کو اور اُس کا غم مجھے

میں وہیں سمجھا ملی جب کسوتِ آدم مجھے / عالمِ غم میں بنایا مرکزِ عالم مجھے

سجدے سے اُٹھنے نہیں دیتا کمالِ خم مجھے / آ کے اس در پر ہے واجب شکرِ بارِ غم مجھے

سب میں آتی ہے نظر کیفیتِ عالم مجھے / ہر حبابِ بحر کا ساغر ہے جامِ جم مجھے

ذرّے ذرّے میں ترا جلوہ سہی او آفتاب / دیکھنے دیتا ہے کچھ یہ دیدۂ پُرنم مجھے

سنگِ بارانِ حوادث اور مجھ ساختہ جاں / میں یہاں کیا کرنے آتا لائے دے کر دم مجھے

آ لپٹ کر تجھ سے رولوں اے بہشتِ کوئے یار / آج کیوں اُس نے سُنایا قصۂ آدم مجھے

اشکِ چشمِ غیر کی اللہ ایسی آبرو / گوہرِ گوشِ صنم دیکھے بچشمِ کم مجھے

اور اذنِ بوسۂ رُخسار اب کیا چاہیے / صاف زلفوں کی طرح اس نے کیا برہم مجھے

ہائے سرگردانیِ ہر روزۂ مہتاب ہائے / داغ ماتھے کا نہ ہوائے فکرِ بیش و کم مجھے

روزِ رُستاخیزِ معنی ہر خیالِ تازہ ہے / اہلِ عالم جانتے ہیں دوسرا عالم مجھے

دل میں کیا کیا حسرتیں تھیں جن کے تم قاتل ہوئے / پیٹنے دو، کیوں رہے اب حسرتِ ماتم مجھے

میں تو تجھ میں محو، تو صرفِ تنزّل دم بدم / تیرے عالم نے دکھائے لاکھوں ہی عالم مجھے

یہ تو کھلتا وصل ہے آئینہ دارِ مدعا / خط جو لکھا اُس کو لکھنا تھا خطِ توام مجھے

کھو گئی شاید دوئی عشقِ لبِ جاں بخش میں / کہتے ہیں بیمار رشکِ عیسیٔ مریم مجھے

گردنِ عاشق ہے وقفِ ہر بلائے آسماں / کچھ تو سمجھا تھا دیا تھا ضعف نے جب خم مجھے

دعوئ غم خواری اور اُن سا عدوئے جاں مرا / کر دیا کیا فرطِ غم نے خود سراپا غم مجھے

واقعی صہبائے ذوقِ جلوہ ہستی سوز ہے
وجد میں لاتی ہے آسیؔ حالتِ شبنم مجھے

(۹۳)

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے
ُبلبلا ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے

سجدہ تیرا فرض سمجھا جو ترا گرویدہ ہے
ماہِ نو پیرِ فلک کا جبہۂ سائیدہ ہے

بے حجابی وہ کہ ہر شے میں ہے جلوہ آشکار
گھونگھٹ اُس پر یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

دل کی وسعت وہ کہ نقطے سے بھی کم سات آسماں
جسم یہ لاغر، خطِ وہمی سے بھی کاہیدہ ہے

فتنہ زارِ حشر سب سمجھے ہیں جس میدان کو
دامنِ نازِ[1] نگہ کا گوشۂ جُنبیدہ ہے

دیکھیے[2] کس چیز سے تشبیہ تیرے حُسن کو
ایک تو ہی دیدہ ہے تیرے سوا نادیدہ ہے

دم بخود رہنے دو کیوں[3] رُسوا ہو مجھ کو چھیڑ کر
غیرِ دریا بُلبلے میں اور کیا پوشیدہ ہے

دیکھ کر محشر خرامی اُن کی اب سمجھا ہوں میں
ذرّہ ذرّہ کاروانِ فتنۂ خوابیدہ ہے

---

[1] تارِ [2] دیکھیے تشبیہ تیرے حُسن کو کس چیز سے [3] مجھ کو چھیڑ کر رُسوا نہ ہو

وادئ عرفاں میں داغِ تہمتِ دخلِ دوئی
نقشِ پائے ناتوانِ عارفِ لغزیدہ ہے

مُنہ لگانا تھا کہ سب گردِ کدورت دُور تھی
بادۂ گل گوں مزاجِ عاشقِ رنجیدہ ہے

ہجر میں کیسا زمین و آسماں کا فاصلہ
جو ستارا ہے وہ داغِ حسرتِ بالیدہ ہے

اتنے بت خانوں مین سجدے ایک کعبے کے عوض
کفر تو اسلام سے بڑھ کر ترا گرویدہ ہے

آدمی کی سرکشی غفلت ہے اپنی اصل سے
ذوقِ سجدہ قطرۂ اُفتادہ میں پیچیدہ ہے

بادۂ رنگِ فنا کا شیشۂ نازک مزاج
یا حبابِ بحر یا میرا دلِ شوریدہ ہے

دیر کیوں اے اذنِ جنّت منزلِ میزاں کے بعد
اب تو ظاہر ہے کہ میرا ہر عمل سنجیدہ ہے

عاشقِ گریاں نے رات اپنی تڑپ کر صبح کی
چشمِ اشک آلودہ بھی زخمِ نمک پاشیدہ ہے

چشمِ نقشِ پا[1] سہی کیوں اس کو ہو بیمِ فنا
جس نے تیری چال کو دیکھا قیامت دیدہ ہے

حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسیِ گستاخ کا ہر جرم نا بخشیدہ ہے

---

[1] عاشقِ شیدا ہو اس میں یا کہ چشمِ نقشِ پا

(۹۴)

مشتاق ترکِ لذّتِ گفتار کیوں کرے
دیدار ہی کے واسطے اصرار کیوں کرے

جب تاب ہی نوائے جگر سوز کی نہیں[1]
صیّاد حرصِ مُرغِ گرفتار کیوں کرے

ہاں خود نہیں وہ، سایہ ہی اُس کا سہی مگر
یوں بے حجاب رُخ پسِ دیوار کیوں کرے

معشوق ہے علاجِ دلِ دردمندِ وصل
گو دل کی بات ہو مگر اقرار کیوں کرے

انصاف اے روانیٔ تیغِ نگاہِ یار
مجھ کو دکھا کے سوئے عدو وار کیوں کرے

کھایا مجھے بھی غم نے عوض کا گلا نہیں
غم اس لیے تو اے مرے غم خوار کیوں کرے

اللہ رے تیرے عشق کی رنگیں مزاجیاں
ایسا نہ ہو تو آنکھوں کو خوں بار کیوں کرے

فرصت کہاں نظارۂ رُخسارِ یار سے
دل فصلِ گُل میں رغبتِ گل زار کیوں کرے

تڑپے تو سر پر ایک قیامت کرے[2] بپا
زلف اُس کی ایسے دل کو گرفتار کیوں کرے

---

[1] نہ ہو [2] بپا کرے

طاقت نہ ہو جو دیکھنے والوں کی آہ کی
یوں کوئی اپنی وضع طرحدار کیوں کرے

اک ہاں میں بے قراریوں کی ہے نہیں یہاں
گو وصل ناگوار ہو انکار کیوں کرے

گردن ہو اور بارِ کرم یہ کہاں قبول
اپنا ہی سر نہ کیوں ہو گراں بار کیوں کرے

باروت کا تو گھر نہ کہیں ہو رقیب کا
یعنی وہ منعِ آہِ شرر بار کیوں کرے

ممسک کرم نہ دیکھ سکے گا رقیب کا
ناصح نہ منعِ چشمِ گہربار کیوں کرے

ترچھی نگاہ تیغِ جدائی سے تیز ہے
عاشق کی مرگِ سہل وہ دشوار کیوں کرے

بوسے سے بڑھ کے بھی جو کوئی شے لذیذ ہو
تسلیم کا مزا ہو تو تکرار کیوں کرے

کیسا کرم یہ ضعف میں ہے پینے کی گھات
سر پر ہمارے سایہ وہ دیوار کیوں کرے

موسیٰ اگر ملیں تو یہ ہے پوچھنے کی بات
دل ہی نہ ہو تو حسرتِ دیدار کیوں کرے

محشر میں کچھ غرض مئے دیدار سے نہیں
دَورِ اخیر میں وہ گنہ گار کیوں کرے

آسیؔ کو بھی بنا ہی کے چھوڑا شراب نوش
جو پارسا ہو صحبتِ مے خوار کیوں کرے

۹۵

کچھ کہوں کہنا جو میرا کیجئے
چاہنے والے کو چاہا کیجئے

حوصلہ تیغِ جفا کا رہ نہ جائے
آئیے خونِ تمنّا کیجئے

فتنۂ روزِ قیامت ہے وہ چال
آج وہ آتے ہیں؟ دیکھا کیجئے

کس کو دیکھا اُن کی صورت دیکھ کر
جی میں آتا ہے کہ سجدا کیجئے

فتنے سب برپا کئے ہیں حسن نے
میری الفت کو نہ رُسوا کیجئے

ہو مسلّم وسعتِ ذوقِ نظر
قطرے میں جب سیرِ دریا کیجئے

حورِ جنّت ان سے کچھ بڑھ کر سہی
ایک دل، کیا کیا تمنا کیجئے

گو سمجھتا ہوں نہانے کا سبب
آئیے ٹھنڈا کلیجا کیجئے

کر دیا حیرت نے مجھ کو آئینہ
بے تکلف منہ دکھایا کیجئے

جوش میں آجائے رحمت کی طرح
ایک اک قطرہ کو دریا کیجئے

نامُرادوں کا جو شکوہ تلخ ہے
کیوں کسی کی بات مانا کیجئے

غیر پیارا ہے نظر شمشیرِ تیز
میری ہی جانب کو دیکھا کیجئے

نام اگر درکار ہے مثلِ نگیں
ایک گھر میں جم کے بیٹھا کیجئے

مل چکے اب ملنے والے خاک کے
قبر پر جا جا کے رویا کیجئے

کون تھا کل باعثِ بے پردگی
آپ مجھ سے آج پردا کیجئے

ایک وصل ان کا وہ قسمت میں نہیں
اور کس شے کی تمنّا کیجئے

کل کی باتوں میں تو کچھ نرمی سی ہے
آج پھر قاصد روانا کیجئے

راہ تکتے تکتے آسیؔ چل بسا
کیوں کسی سے آپ وعدا کیجئے

(٩٦)

خاکِ پا آنکھوں میں عاشق ہیں لگانے والے
دل میں آجا ارے او عرش کے جانے والے

تیری الفت میں سُناتے ہیں سُنانے والے
جان سے جائے گا او دل کے لگانے والے

کوئے قاتل سے کوئی پھرتے ہیں جانے والے
وہی جاتے ہیں جو ہیں سر کے کٹانے والے

اس طرف آ ارے او ناز سے جانے والے
ہم ہیں قدموں کے تلے آنکھیں بچھانے والے

صورتِ نقشِ قدم بیٹھے ہیں کوچے میں ترے
دیکھیں کس طرح اُٹھاتے ہیں اُٹھانے والے

آنکھیں پتھرا گئیں صورت بھی دکھا دے ظالم
ارے او پردے سے آواز سنانے والے

دردِ دل بھی سببِ رحمتِ حق ہوتا ہے
تیرے قربان ہم او دل کے ستانے والے

دل کے دُکھنے میں عجب طرح کی اِک لذت ہے
یا خدا خوش رہیں عاشق کے ستانے والے

ابھی تعلیم نہ کر ترکِ محبّت کی مجھے
ذل لگا لے کہیں او میرے سکھانے والے

قبر پر بیٹھ کے روؤ گے نہ پاؤ گے جواب
پھر کے آنے کے نہیں جان سے جانے والے

دل مرا توڑ کے بے درد کہاں جاتا ہے
ڈر خدا سے ارے او کعبہ کے ڈھانے والے

مرغِ جاں طعمۂ شاہینِ اجل ہو جائے
باز ہم عشق سے تیرے نہیں آنے والے

چال آفت ہے تو پازیب کی جھنکار غضب
آئیے فتنۂ محشر کے جگانے والے

ہاتھ مہندی سے بھبھوکا جو بنایا تو کیا
آپ ہیں آگ کلیجوں میں لگانے والے

تو ادھر آئے تو عاشق ترے اے نورِ نظر
پُتلی کی طرح ہیں آنکھوں میں بٹھانے والے

آنے کا وعدہ جو لیتا ہوں تو کہتا ہے وہ شوخ
آج ہم پاؤں میں مہندی ہیں لگانے والے

جیتے جی کون ترے در سے اُٹھا سکتا ہے
بس اٹھائیں گے جنازے کے اٹھانے والے

سو رہے کھا کے اگر کچھ تو وہ بہتر ہے کہیں
اے غمِ الفتِ محبوب کے کھانے والے

حشر میں بیٹھیں گے زیرِ قدمِ پاک نبیؐ | بے ٹھکانے کہیں ہوتے ہیں ٹھکانے والے
بال بال اپنے اسیروں کے جکڑ لیتے ہیں | کیا غضب ہوتے ہیں زلفوں میں پھنسانے والے

اب کہیں آسیؔ نالاں ہے نہ قیس و فرہاد
کیا ہوئے کنگرہ[1] عرش ہلانے والے

---

[1] کو ٹھے عرشِ معلّیٰ کے

(۹۷)

بلبلے کی طرح آنکھوں کو جو اندھا کرتے
تجھ کو اے بحرِ کرم دل ہی میں دیکھا کرتے

نالہ ہائے شبِ غم حشر یہ برپا کرتے
آج وہ ہم سے وفا وعدۂ فردا کرتے

جا کے بُت خانے میں کس طرح نہ سجدا کرتے
بُت میں بھی تُو نظر آیا تو بتا کیا کرتے

بے ترے جینے کی کس طرح تمنا کرتے
مر نہ جاتے جو شبِ ہجر تو ہم کیا کرتے

دیکھتے کعبۂ ابرو کو تو سجدا کرتے
پاتے اس مصحفِ عارض کو تو چوما کرتے

یاالٰہی دلِ احباب کے ارمان کے ساتھ
اپنی محفل سے وہ دشمن کو نکالا کرتے

کشتۂ ضبطِ نفس ہوں میں فلک شاہد ہیں
یہ کہاں ہوتے، اگر ہم کوئی نالا کرتے

عالم اِک آئینہ خانہ ہے ترے جلوے کا
ہم جدھر دیکھتے آخر تجھے دیکھا کرتے

چھیڑ کر باتیں بھی اک دن نہ سُنیں اُس بت کی
معجزہ تھا کہیں پتھر کو جو گویا کرتے

دلِ بیمار سے دعوٰی ہے مسیحائی کا
چشمِ بیمار کو اپنی نہیں اچھا کرتے

دلِ پُر داغ یہ رو رو کے کہا کرتا ہے
آنکھیں پائی ہیں تو صورت تری دیکھا کرتے

کیا حبابوں میں ہوا عنصرِ فرہاد کی ہے
سر تو یہ بادِ ہوائی نہیں پھوڑا کرتے

جائے دل آئے جو پہلو میں بجا تم نے کیا
دل کو لے جاتے جو پہلو سے تو بے جا کرتے

حاملِ بارِ امانت ہو ظلوم اور جہول
اور کیا اس سے زیادہ مجھے رُسوا کرتے

ہم نہ تھے محرمِ بے پردگیِ خلوتِ خاص
کچھ تجھے شرم بھی آتی نہیں پردا کرتے

نہیں عکس آئینہ خانے میں تو ذی عکس نہیں
وہی پنہاں تھے اگر ہم کو نہ پیدا کرتے

جانتے تھے کہ شبِ ہجر نہیں کٹنے کی
پھر وہ خوش ہو کے نہ کیوں وعدۂ فردا کرتے

آنکھ آئینے کی اللہ نے بخشی ہوتی
منہ ترا صبح دم اُٹھتے ہوئے دیکھا کرتے

گال والشمس ہیں، والنجم ہیں تل، صاد آنکھیں
مثلِ مصحف ہیں وہ آغوش میں آیا کرتے

صفحۂ آئینہ پر ہم نے یہ مصرع لکھا
آنکھ والے تھے جو صورت تری دیکھا کرتے

جس کے دل چاک تھے ہم، تھا وہی قاتل اپنا
صفتِ غنچہ نہ کیوں خون ہم اخفا کرتے

دیکھ سکتا فلکِ سفلہ اگر اتنا بھی
ہم[1] تجھے چشمِ تصور ہی سے دیکھا کرتے

شمع ساں دل ہیں گداز آپ کے جاں سوزوں کے
آپ محفل میں بلاتے بھی تو رویا کرتے

دسترس آرسی کی طرح اگر پا جاتا
گھورتا میں تجھے، دشمن مرے دیکھا کرتے

اپنے بیمار کے پاس اُن کو ضرور آنا تھا
مار ہی ڈالتے آکر جو نہ اچھا کرتے

تو نے دعوئے خدائی نہ کیا خوب کیا
اے صنم ہم ترے دیدار کو ترسا کرتے

زندگی فرقتِ دل دار میں کیا اے آسیؔ
مر نہ جاتے جو شبِ ہجر تو ہم کیا کرتے

---

[1] سامنے تجھ کو بٹھائے ہوئے دیکھا کرتے۔

(۹۸)

نہ کبھی کے بادہ پرست ہم نہ ہمیں یہ کیفِ شراب ہے
لبِ یار چوُمے ہیںؔ خواب مین وہی جوشِ مستیٔ خواب ہے

مئے عشق جس سے ٹپکتی ہے دلِ سوختہ وہ کباب ہے
جو کرے کباب دل و جگر اُسے سمجھیں ہم کہ شراب ہے

وہی پیشِ چشم ہے ہر نظر مگر اب بھی شوقِ نقاب ہے
وہی میری ہر رگ وپے میں ہے مگر اب بھی مجھ سے حجاب ہے

کبھی میری بھی تجھے چاہ تھی ترے دل میں میری بھی راہ تھی
کبھی اس طرف بھی نگاہ تھی کہ یہ سب خیال ہے خواب ہے

دلِ مُبتلا ہے ترا ہی گھر اسے رہنے دے کہ خراب کر
کوئی میری طرح تجھے مگر نہ کہے کہ خانہ خراب ہے

اگر آنکھ کھولو تو کچھ نہیں اثرِ وجود بجز فنا
ہے سوادِ ہستیٔ بے بقا کہ بیاضِ چشمِ حباب ہے

اُنہیں کبرِ حسُن کی نخوتیں مجھے فیضِ عشق کی حیرتیں
نہ کلام ہے، نہ پیام ہے، نہ سوال ہے، نہ جواب ہے

کوئی گُل نہیں کہ نہ جس میں ہو مرے گل کی نکہتِ جاں فزا
مرے مست کرنے کو پھوُل بھی تو چمن میں بادۂ ناب ہے

لہ تھے

کبھی[1] تجھ کو دل میں بھی غور ہے کہ نظارے کا یہی طور ہے
یہ سمجھ تری کہ وہ اور ہے یہی منہ پر اُس کے نقاب ہے

یونہی اپنے کوچے میں رہنے دے نہ عبث اُٹھا کے ستا مجھے
جو اُٹھے تو دودِ[2] جگر اُٹھے کہیں مجھ میں اُٹھنے کی تاب ہے

دلِ عندلیب یہ شق نہیں، گل و لالہ کے یہ ورق نہیں
مرے عشق کا وہ رسالہ ہے ترے حسُن کی یہ کتاب ہے

جو حجاب تھا وہ اُٹھا مگر کہ وہ دل میں اب ہوئے جلوہ گر
مرے گھر میں بارے کیا گزر یہ خیال کیجیے کہ خواب ہے

کہیں پوچھ ہی اُٹھے وہ صنم کوئی دم کٹا ہے بغیرِ غم
وہ محاسبے میں ہے دم بہ دم جسے خوفِ روزِ حساب ہے

پے ترکِ شاہد و مے ابھی کروں استخارہ میں کس طرح
وہ جو خاکِ پاک کی سبحہ تھی وہی رہنِ جامِ شراب ہے

وہ ہزار آسیؔ زار سے ملیں لطف سے رحم سے پیار سے
مگر اپنے دل میں نہ دیں گے گھر کہ وہ ایک خانہ خراب ہے

---

[1] کبھی دل میں بھی تجھے [2] درد

(۹۹)

پسِ مرگ تو اُس کو میں دیکھوں بھلا کہیں ایسے بھی بخت خدا دے مجھے
سرِ گور جو آئے وہ ماہ لقا کوئی خوابِ لحد سے جگا دے مجھے
ترے بارِ فراق سے پس میں گیا دلِ غم زدہ سینے میں خون ہُوا
مگر اب بھی تو کوئی برنگِ حنا ترے قدموں سے لے کے لگا دے مجھے
دمِ مرگ غضب ہے وہ گرم نظر ہوئے رشکِ مسیح وہ ہونٹ اگر
یہی کھیل ہے ان دلوں آٹھ پہر وہ جلا دے مجھے یہ جلا دے مجھے
مری آفتِ جاں ہے وہ کج نظری مجھے نیست کرے گی وہ بے کمری
یہی چال جو اُس کی ہے ناز بھری تو نہ خاک میں کیسے ملا دے مجھے
کسی طرح تو سنبھلے یہ جانِ حزیں مرے پاس وہ آئے ضرور نہیں
رہے دُور ہی مجھ سے وہ ماہ جبیں مگر اپنی جھلک تو دکھا دے مجھے
ہوئی عمر فراق میں مجھ کو مرے، ترے ساغرِ چشم ہیں دونوں بھرے
وہ جو آبِ حیات کو مات کرے کوئی ایسی شراب پلا دے مجھے
ترے کوچے میں آ کے مرا ہوں صنم، نہ ہے آنکھوں میں جان نہ سینے میں دم
یہ پڑا جو ہوں صورتِ نقشِ قدم کوئی خاک میں آ کے مِلا دے مجھے
یہی حسرتِ دل ہے کہ اے مرے رب اُسے اتنی تو ہمتِ خیر دے اب
کروں وصل میں بوسے میں جتنے طلب وہ کچھ اور بھی اُس سے سوا دے مجھے
جو وہ تیغِ نگاہ کہیں ہو علم کوئی پوچھے نہیں جو بپا ہو ستم
کہیں سر ہوں بدن سے کسی کے قلم کہیں خون میں آ کے ڈبا دے مجھے
یہی سوچ ہے آسیؔ خستہ جگر، مرے خشک ہوں کیسے یہ دامنِ تر
وہی دامنِ پاک سے اپنے مگر کہیں کھا کے جو رحم ہوا دے مجھے

(۱۰۰)

آج وہ ہیں مجمعِ احباب ہے
ایک مہجور آسیؔ بے تاب ہے

میرے جسمِ زار کا ہر رونگٹا
نالہ زارِ فرقتِ احباب ہے

اے دُرِ خوش آبِ دریائے وجود
ہجر میں دل ماہیِ بے آب ہے

ذرّہ ذرّہ کوچۂ سفّاک کا
محشرستانِ دلِ احباب ہے

موت تھی یا بے قراری کا علاج
میّت اپنی کشتۂ سیماب ہے

دیکھئے حوریں دکھائی جاتی ہیں
امتحانِ عاشقِ بے تاب ہے

وصل میں بہرِ بنائے زندگی
ہر سپیدہ صبح کا سیلاب ہے

میری آنکھیں اور دیدار آپ کا
یا قیامت آگئی یا خواب ہے

ڈوب اے غوّاصِ دریائے طلب
وصلِ جاناں گوہرِ نایاب ہے

قطرہ دریا کا سوایا ہو گیا
روئے چار آنسو جہاں پنجاب ہے

اے نمک زارِ تبسّم واہ وا
زخم سینے کا گلِ شاداب ہے

وصل ہو، دورِ دہن ہو یا کمر
ان میں جس کو دیکھئے نایاب ہے

قصرِ تن پیری میں مسجد ہو گیا
قد جہاں خم ہو گیا محراب ہے

روزِ فرقت بھی ہے کیا رنگیں مزاج
بادۂ گل رنگ خونِ ناب ہے

کچھ نہیں ہوتا ہے جب تک کچھ نہ ہو
یہ طلسمِ عالمِ اسباب ہے

چوٹ کھائی تم نے اے آسیؔ کہیں
کچھ نہ کچھ دل آج لذت یاب ہے

(۱۰۱)

حجابِ گنجِ مخفی میں نہاں تھے — الٰہی ہم کہاں آئے کہاں تھے
کسی نے بھی نہ دیکھا ہم جہاں تھے — بدن تھی خلق ہم مانندِ جاں تھے
عیاں ایسے کہ ہر شے میں نہاں تھے — نہاں ایسے کہ ہر شے سے عیاں تھے
بسانِ نالہ سر کھینچا ہے باہر — ہم اہلِ درد کے دل میں نہاں تھے
نکالا کرتے تھے بالوں کی کھالیں — کبھی ہم بھی خیالِ شاعراں تھے
رہے رستے ہی میں قدموں سے چھٹ کر — مگر ہم نقشِ پائے رفتگاں تھے
جب اُس کوچے کی حاصل تھی گدائی — خداوندِ زمین و آسماں تھے
ہوئے ظاہر بسانِ نورِ باطن — دلِ اربابِ دل میں ہم نہاں تھے
ترے کوچے میں جب چلنا پڑا تھا — بسانِ اشک آنکھوں سے رواں تھے
کچھ ایسے نشۂ ہستی سے بہکے — نہیں جانا کہاں آئے کہاں تھے
سراپا درد تھے مانندِ دل ہم — مرض تھے پر نصیبِ دوستاں تھے
کہاں داغ اُس کی اُلفت کے، کہاں دل — یہ دُرِ ہم گنجِ مخفی میں نہاں تھے
نہ دوڑے جز سوادِ کوچۂ یار — مگر ہم بھی خیالِ دوستاں تھے
نہ کیوں صیاد وقتِ مرگ آتا — کہ ہم باغِ جہاں میں مرغِ جاں تھے
نہ ہرگز بزمِ ساقی میں رُکے ہم — مگر[1] دورِ شرابِ ارغواں تھے
حمائل تھے گلوئے دختِ رز میں — مگر[2] دستِ خیالِ مے کشاں تھے

---

[1] کہ ہم [2] کہ ہم

رہی راتوں کو اکثر سیرِ افلاک مگر ہم تیرِ آہِ بے کماں تھے
کہاں ڈالا خلل وصلِ عدو میں گجر ہی تھے نہ ہم بانگِ اذاں تھے
بہارِ باغِ ہستی تھی ہمیں سے نظر سے گو، برنگِ بو، نہاں تھے
عیاں ایسے کہ تھے سب سے نہاں ہم نہاں ایسے کہ ہر شے میں عیاں تھے
نہ تھا معشوق جس میں غیرِ عاشق عجب خلوت تھی وہ بھی ہم جہاں تھے
اُٹھے ہم اُٹھ گیا پردہ دوئی کا ہمارے اُس کے بس ہم درمیاں تھے
چلے زیرِ زمیں بے بال و پر آج کبھی ہم طائرِ عرش آشیاں تھے
نہ شکر اس کا کیا تلوار کھا کر کہ زخم اپنے دہانِ بے زباں تھے
کچھ ایسی تھی شبِ غم کی چڑھائی کہ نالے شمعِ بزمِ لامکاں تھے
گئے وہ دن کہ ہر دم یہ جگر، دل لہو بن بن کے آنکھوں سے رواں تھے
نہ رہتے تھے ٹھکانے ایک ساعت کبھی ہم بھی حواسِ عاشقاں تھے
گلستانِ جہاں میں کون ٹھہرا جو سرو آئے نظر سروِ رواں تھے
خدا نے ان کو پہنچایا ہدف تک خدنگِ آہ تیرِ بے کماں تھے
جو اُس محفل میں ہم جانے بھی پائے ق پیاپے آنسو آنکھوں سے رواں تھے
نہ نکلی بات منہ سے صورتِ شمع زباں ایسی تھی گویا بے زباں تھے

مرے پہلو میں کل بیٹھے تھے آسیؔ
مگر جب تک تھے مثلِ دلِ تپاں تھے

لہ ہے

(۱۰۲)

غلط ہے آسیؔ یہ بدگمانی وہاں کسی کا گزر نہیں ہے
کہ آج تک تیری حالتوں کی کہیں[1] کسی کو خبر نہیں ہے

وہ حال اس طرح پوچھتے ہیں کہ اُن کو گویا خبر نہیں ہے
تجاہل ایسا ہے دردِ دل سے کہ دل میں جس طرح گھر نہیں ہے

وہ کیوں سہیں حُسن کا تقاضا یہی نہ[2] ہے کچھ حجاب میرا
نقاب اُلٹیں وہ بے تکلف کہ مجھ کو تابِ نظر نہیں ہے

وصال و فرقت کے تند[3] شکوے تو کیوں ہو دیدار کی تمنّا
جو غیر اُس کے کسی کو دیکھے کبھی وہ صاحب نظر نہیں ہے

ہم اور ضبط اب کہاں وہ طاقت[4] چھپائیں اب کس میں سرِ الفت
تمہارے تیروں نے چھید ڈالے وہ دل نہیں وہ جگر نہیں ہے

کہو نہ کہتے تھے ہم یہ تم سے کہ حسن و عشق آخر ایک ہوں گے
دیئے ہیں وہ بارِ غم نے جھونکے کہ اب یہاں بھی کمر نہیں ہے

بسانِ عمرِ رواں کسی کو سفر نہ پیش آئے بے کسی کا
کہ راہ میں نقشِ پا نہیں، میلِ رہ نہیں، راہبر نہیں ہے

کہاں[5] وہ آئے کدھر[6] وہ آئے کہاں وہ ٹھہرے کدھر سدھارے
انہیں میں ہم محو تھے کچھ ایسے کہ ہم کو ان کی خبر نہیں ہے

---

[1] کسی کو ہرگز [2] اب ہے [3] فکر [4] یہ شعر بیاض میں قلم زد تھا [5] سے

نہ کیوں[1] ہو دل کو یقین پیدا شہادت اُس کی ہے غیب اُس کا
نقاب منہ پر نہیں ہے لیکن کسی کو تابِ نظر نہیں ہے

رقیب جب تک کہ اُٹھ نہ جائے ہمیں تُو پاس اپنے کیوں بُلائے
سوا ترے کچھ نظر نہ آئے ہماری ایسی نظر نہیں ہے

جو اپنے دم سے بھی آدمی کو نصیب ہو اتحادِ کامل
کے نہیں خلوت انجمن میں کسے وطن میں سفر نہیں ہے

عدو[2] نہ مجھ سے لپٹنے آئے[3] کہ اپنی ہستی کو روکے جائے[4]
مجال ہے ہاتھ وہ لگائے[5] یہ میں ہوں تیری کمر نہیں ہے

خفا نہ ہو بات مانو میری نہ راہ لو غیر کی گلی کی
یہ سچ ہے بے خود پڑا ہے آسیؔ مگر کبھی بے خبر نہیں ہے

---

[1] یہ شعر بیاض میں قلم زد تھا [2] رقیب [3] آتا [4] جاتا [5] لگاتا

(۱۰۳)

دلِ عاشق میں قلق حد سے سوا ہوتا ہے　　ذکرِ محبوب بھی اندوہ فزا ہوتا ہے

بُتِ پندار جو اس میں سے جدا ہوتا ہے　　یہی دل رُتبے میں کعبہ سے سوا ہوتا ہے

اِنہیں کانوں سے انا الحق کے سُنے ہیں دعوے　　آدمی عشق میں کیا جانئے کیا ہوتا ہے

حُسن کی چارہ گری کا ہے بڑا شور مگر　　دردِ اُلفت کہیں محتاجِ دوا ہوتا ہے

غیر کو غیر جو کہئے تو غلط ثابت ہو　　اور کہئے کہ وہی ہے تو خفا ہوتا ہے

سوئے منصور انا الحق کی غلط نسبت تھی　　کوئی کہہ دے کہیں بندہ بھی خدا ہوتا ہے

دل جو تھا خاص گھر اُس کا نہ بنایا افسوس　　مسجد و دَیر بنایا کرو، کیا ہوتا ہے

دل رُبائی تری ہر بار نرالی نکلی　　واہ رے حُسن کہ ہر جلوہ نیا ہوتا ہے

عشقِ کامل ہو تو مرشد نہیں ایسا کوئی　　خود وہی قبلہ وہی قبلہ نما ہوتا ہے

امتیازِ من وتو کچھ بھی تو باقی رہتا　　بادۂ جلوہ غضب ہوش رُبا ہوتا ہے

دشمنِ زیست جدائی ہے تو ملنا کیا ہے　　قطرہ دریا سے جو ملتا ہے فنا ہوتا ہے

غیر سے قطعِ نظر چاہئے عاشق کے لیے　　حاصلِ خلوت و بزم ایک مزا ہوتا ہے

محو و اثبات کے جھگڑے میں پھنسا کر ہم کو　　دیکھیں کب لطف ترا عقدہ کشا ہوتا ہے

بے حجابی تھی پسند اُن کو ابھی کل کی ہے بات　　آج پردے میں ہیں پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

جس میں دیدار ہو وہ بھی ہے قیامت کوئی　　یہ قیامت ہے کہ وہ مجھ سے جدا ہوتا ہے

ابھی دیکھا نہیں اُس پر تو یہ بے تابی ہے　　دیکھئے دیکھ کے کیا حال مرا ہوتا ہے

پھر گئے خلد کو آدم مگر ابلیس تو جائے　　نہ بُرا سوچ کسی کا کہ بُرا ہوتا ہے

ذرّۂ خاکِ قدم سلطنتِ ہفت اقلیم　　کیا گدائے درِ دل دار گدا ہوتا ہے

ہمتِ شیخ کی صیقل کی بدولت آسیؔ
یہی دل آئینۂ روئے خدا ہوتا ہے

(۱۰۴)

زخمِ دل ہم دِکھا نہیں سکتے
دل کسی کا دُکھا نہیں سکتے

ہاں وہ صورت دِکھا نہیں سکتے
کیا صدا بھی سُنا نہیں سکتے

وہ یہاں تک جو آ نہیں سکتے
کیا مجھے بھی بُلا نہیں سکتے

وعدہ بھی ہے تو ہے قیامت کا
جس کو ہم آزما نہیں سکتے

لذت اک گونہ چاہیئے مجھ کو
کیا وہ دل بھی دُکھا نہیں سکتے

دل بھی نکلا حریف عنقا کا
اب کہیں تجھ کو پا نہیں سکتے

اب سے پھر جاؤ حضرتِ موسیٰ
تابِ دیدار لا نہیں سکتے

آپ بھی بحرِ اشک ہیں گویا
آگ دل کی بجھا نہیں سکتے

اُن سے امیدِ وصل اے توبہ
وہ تو صورت دکھا نہیں سکتے

مدد اے نالہ ہائے بے تابی
سوتے ہیں وہ جگا نہیں سکتے

اُن کو گھونگھٹ اٹھانے میں کیا عذر
ہوش میں ہم جو آ نہیں سکتے

عشق کیسا تواں فزا نکلا
کس کے طعنے اُٹھا نہیں سکتے

کس کے دل تک پہونچتی ہے یہ بات
دلِ دشمن دُکھا نہیں سکتے

مانگتے موت کی دُعا لیکن
ہاتھ دل سے اُٹھا نہیں سکتے

اُن کو دعوائے یوسفی آسیؔ
خواب میں بھی جو آ نہیں سکتے

(۱۰۵)

جُز ہم زباں نہ کوئی ملا قدر داں مجھے
آنکھیں کسی کی کہتی ہیں جادو بیاں مجھے

کرنا ہے بزمِ شعر میں وصفِ دہاں مجھے
دم بھر کو آج کر دے خدا غیب داں مجھے

لائی عدم میں کشتیِ عمرِ رواں مجھے
پہونچا دیا ہے بیٹھے بٹھائے کہاں مجھے

آغوش میں بھی چاند سی صورت ضرور ہے
رفعت اگر ملی صفتِ آسماں مجھے

بلبل نہیں میں طائرِ نکہت ہوں اے نسیم
ہے ایک غنچہ ساں قفس و آشیاں مجھے

گل ہائے نقشِ پا کی طرح باغِ دہر میں
جو چل گئی ہوا ہوئی بادِ خزاں مجھے

جائے سخن زبان سے شعلہ بلند ہے
محفل میں ایک شمع ملی ہم زباں مجھے

سنتا ہوں یار کے لب، چاہِ ذقن سے میں
یوسف نہ گر پڑیں تو نہ کہنا کنواں مجھے

اے مُشتِ خاک چل دیئے ہوش و حواس و صبر
لازم ہے سمجھیں گردِ پسِ کارواں مجھے

اے نقشِ پا ہدایتِ راہِ فتادگی
تلقینِ نالہ اے جرسِ کارواں مجھے

صدموں نے ہجر کے مجھے بے کیف و کم کیا
کیوں[1] وصل میں قید زمان و مکاں مجھے

دل کیا کہ جان میں ہے جگہ تیری اے پری
قدِ سہی ہوا الفِ لفظِ جاں مجھے

پارے کی طرح شعلۂ غم لے کے اڑ گیا
ڈھونڈو گے بھی تو پاؤ گے اب تم کہاں مجھے

صبر و قرار و ہوش و خرد کس کو روئیے
پامال کر رہا ہے غمِ رفتگاں مجھے

سینے میں دل اگر نہ ہلے حرصِ نالہ کیوں
کیا بات کہہ گیا جرسِ کارواں مجھے

حق پوچھئے تو بات تھی انصاف کی یہی
نامِ عدو لیا تو کہا بد زباں مجھے

---

[1] غالباً یہ مصرع اس طرح ہوگا (کیوں وصل میں ہو قید زمان و مکاں مجھے)

باغِ جہاں میں طائرِ رنگِ پریدہ ہوں
خوفِ قفس ہے کچھ نہ غمِ آشیاں مجھے

گزرا میں اپنی جان سے کس کا بُرا کیا
کیوں خاک میں ملاتے ہیں[1] اہلِ جہاں مجھے

ملتا ہوں دم میں راہ روانِ عدم سے میں
بانگِ جرس ہے ہر نفسِ کارواں مجھے

کیوں کر کہوں کہ چار نگاہیں عدو سے کیں
آدھی نگاہ نے تو کیا نیم جاں مجھے

گزرا جدھر سے جوشِ جنوں میں ہدف بنا
پیر و جوانِ خلق ہیں تیر و کماں مجھے

لائی عدم سے لئے[2] بھی چلی جانبِ عدم
کیسی رفیق[3] راہ ہے عمرِ رواں مجھے

اس قافلے میں ہوں جرسِ کارواں کی طرح
کرتا ہے سینہ کوبِ غمِ ہم رہاں مجھے

خارِ سرِ حریمِ چمن ہوں میں ناتواں
گلچیں سے ڈر ہے کچھ نہ غمِ باغباں مجھے

وہ آہ کر کہ پھونک دے دونوں جہان کو
بھڑکا رہا ہے شعلۂ سوزِ نہاں مجھے

جاتا تو ہوں عیادتِ چشمِ علیل کو
پٹکیں گی خاک پر نگہِ ناتواں مجھے

اغیار پر نگاہِ کرم میرے سامنے
کیا تیر مارتا ہے وہ ابرو کماں مجھے

آسی شہیدِ عشق ہوں مُردہ نہ[4] جانیو
مر کر ملی ہے زندگیِ جاوداں مجھے

---

[1] ہو [2] لے چلی پھر [3] رفیق مل گئی [4] نہ جاننا

(۱۰۶)

میں اور مئے ناب مرا منہ یہ کہاں ہے
تلچھٹ بھی اگر دے کرمِ پیرِ مغاں ہے

میرے سرِ شوریدہ کو محروم نہ رکھنا
سنتا ہوں کہ چوکھٹ تری ماوائے جہاں ہے

کیا راہِ طلب مر کے بھی طے ہوتی ہے آسی
آسودگی حرفیست، یہاں ہے نہ وہاں ہے

(۱۰۷)

پھر مزاج اُس رند کا کیوں کر ملے
جس کو اُس کے ہاتھ سے ساغر ملے

یہ بھی ملنا ہے کہ بعد از صد تلاش
حدِ وہم و فہم کے باہر ملے

کچھ نہ پوچھو کیسی نفرت ہم سے ہے
ہم ہیں جب تک وہ ہمیں کیوں کر ملے

ظاہر و مظہر میں فرق ایسا نہیں
پیر ہاتھ آیا تو پیغمبر ملے

میری آنکھیں اور اُس کی خاکِ پا
تیرے کوچے کا اگر رہبر ملے

وصل ہے سر جوشِ صہبائے فنا
پھر اگر کوئی ملے کیوں کر ملے

کعبہ، بت خانہ، کلیسا، صومعہ
پھرتے ہیں در در کہ تیرا گھر ملے

کس قدر ٹھہرا بلند ان کا مقام
مل گیا مولا جسے حیدرؓ ملے

ملنے کے پہلے فنا ہونا ضرور
پھر فنا جو ہو گیا کیوں کر ملے

آسیؔ گریاں ملا محبوب سے
گل سے شبنم جس طرح رو کر ملے

(۱۰۸)

ہے صیدِ فنا جو ہدفِ تیرِ نظر ہے
چیرو مرے سینے کو نہ دل ہے نہ جگر ہے

اے خنجرِ نازِ بُتِ طنّاز کدھر ہے
دردِ دلِ عاشق کی دوا زخمِ جگر ہے

وہ دور چلا جامِ مئے بے خبری کا
ہم وہ ہیں کہ وہ ہم، نہیں اتنی بھی خبر ہے

ملنے کی یہی راہ نہ ملنے کی یہی راہ
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہ گزر ہے

پہنچو گے اُسی کوچے میں جس راہ سے نکلو
جو راہ ہے اُس کوچے کی بے خوف و خطر ہے

وہ تیغِ نگہ، پیکِ اجل اور مرے پاس
ٹوٹے ہوئے دل کی وہی ٹوٹی سی سپر ہے

انجام کی منزل ہے کڑی دیکھئے کیا ہو
دنیا میں جو آئے ہو یہ آغازِ سفر ہے

شرم آتی ہے کہتے ہوئے عاشق ہوں کسی کا
نالوں میں نہ تاثیر نہ آہوں میں اثر ہے

کیا مر ہی گیا عاشقِ دیوانہ تمہارا
جنگل میں نہ صحرا میں کہیں شور نہ شر ہے

کیا روشنی اُس عارضِ پُر نور میں ہوگی
جب نقشِ قدم رشکِ دہِ شمس و قمر ہے

عمر اپنی رواں ہے تو اقامت سے سروکار
سمجھے اگر انسان تو دن رات سفر ہے

جُز نام، نشاں اور پتا کچھ نہیں جس کا
عشاق کی ہستی بھی حسینوں کی کمر ہے

ہیں یاس کی نظریں مری یا تیروں کی بوچھار
صف بندیٔ مژگانِ صنم زیر و زبر ہے

عاشق کے لبِ خشک ہوں یا دیدۂ پُر نم
باہر ترے دفتر سے کوئی خشک نہ تر ہے

سُنتے ہیں کہ ہر سمت نظارہ ہے اُسی کا
جو آگے نہ پیچھے نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

شمشاد سے آسی کے عجب رنگ سُنے ہیں
اپنی نہ خبر کچھ نہ پرائے کی خبر ہے

لغزش ہوئی جب حضرتِ آدم سے نبی کو
آسی کو بُرا کیوں کہو وہ بھی تو بشر ہے

لہ اور لہ ایک بیاض میں یہ شعر بھی درج ہے ۱ اپنی نہ خبر کچھ نہ پرائے کی خبر ہے ؛ بس شکل تمہاری ہے کہ وہ پیش نظر ہے لہ گزرو

(۱۰۹)

قطرہ وہی کہ روکشِ دریا کہیں جسے
یعنی وہ میں ہی کیوں نہ ہوں تجھ سا کہیں جسے

وہ اک نگاہ اے دلِ مشتاق اُس طرف
آشوب گاہِ حشرِ تمنا کہیں جسے

بیمارِ غم کی چارہ گری کچھ ضرور ہے
وہ درد دل میں دے کہ مسیحا کہیں جسے

اے حسنِ جلوۂ رُخِ جاناں کبھی کبھی
تسکینِ چشمِ شوقِ نظارا کہیں جسے

اس ضعف میں تحملِ صوت و صدا کہاں
ہاں بات وہ کہوں کہ نہ کہنا کہیں جسے

یہ بخشش اپنے بندۂ ناچیز کے لیے
تھوڑی سی پونجی ایسی کہ دنیا کہیں جسے

وہ ایک ذرہ خاکِ قدم بہرِ چشمِ شوق
موسیٰ نگاہ مہرِ تجلیٰ کہیں جسے

ہم بزم ہو رقیب تو کیوں کر نہ چھیڑئیے
آہنگِ سازِ درد کہ نالا کہیں جسے

پیمانۂ نگاہ سے آخر چھلک گیا
سرجوشِ ذوقِ وصلِ تمنا کہیں جسے

آسیؔ جو گل سے گال کسی کے ہوئے تو کیا
معشوق وہ کہ سب سے نرالا کہیں جسے

(۱۱۰)

غش نہ آجائے کہیں مانندِ موسیٰ دیکھئے — میری آنکھوں سے نہ[1] اپنا آپ جلوا دیکھئے

دیکھ کر منہ یار کا کیا جانئے کیا دیکھئے — منہ دکھائی دے اگر اس کی کفِ پا دیکھئے

نور و ظلمت جو ہو سب میں ایک جلوا دیکھئے — رنگ و بے رنگی میں، سب میں رنگ پیدا دیکھئے

میں نہیں کہتا کہ سنبل یا نہ لالا دیکھئے — زلف و روئے یار کا بھی ان میں جلوا دیکھئے

جی میں ہے اپنے ہی جامہ میں وہ جلوا دیکھئے — وسعتِ دامانِ صحرائے تمنا دیکھئے

صبح پیری میں تو ایسا ہو کہ مثلِ پیرِ صبح — چاکِ دل میں شاہدِ خورشید سیما دیکھئے

کی نظر جس نے مرے باطن میں تو ظاہر ہوا — وہ بھی قطرہ ہے نہ جس قطرے میں دریا دیکھئے

آفتابِ روئے لیلیٰ جلوہ گر ذرّوں میں ہے — چشمِ مجنوں سے جو موجِ ریگِ صحرا دیکھئے

میں تصوّر سے اٹھا دیتا ہوں پردا بیچ کا — ہجر کی شب آپ بھی میرا تڑپنا دیکھئے

خامشی اچھی نہیں اے خضرِ راہِ مدعا — کچھ تو کہئے گو یہی کہئے کہ رستا دیکھئے

دل بنا ہر جزوِ تن، ہر داغِ دل اک چشمِ شوق — اپنی دید، اپنے تصوّر کی تمنا دیکھئے

کیا لگایا ہے، ہجومِ غم نے میلا ان دنوں — آئیے بھی دل میں عاشق کے تماشا دیکھئے

سر برہنہ پھر رہے ہیں ہم بسانِ آفتاب — آنکھ اگر ٹھہرے تو نورِ داغِ سودا دیکھئے

دید کے قابل سہی ہر لالہ و گل اٹھتے بہار — کچھ نظر آتا نہیں تیرے سوا کیا دیکھئے

کیا بتاؤں کس نے نظروں میں کیا عالم سیاہ — آئینے میں اپنی آنکھیں دے کے سُرما دیکھئے

وہ نظر دے برقِ خرمن سوزِ پندارِ خودی — تو ہمیں میں ہو مگر تجھ کو اکیلا دیکھئے

---

[1] نہ آپ اپنا تماشا [2] کی

موسیٰ و جبریل کی بھی دنگ ہے دید و شنید | دیکھنا سنئے ہمارا اور سُننا دیکھئے
کرتی ہے دیوانہ آخر آپ کی تصویر بھی | محوِ زینت ہو کے آئینہ نہ اتنا دیکھئے
حسبِ استعدادِ طالب چاہیئے فیضِ کرم | منہ ہمارا دیکھئے اور ایک بوسا دیکھئے
صورتِ نقشِ کفِ پا خاک میں ملنے کے بعد | اپنے رستے میں مرا آنکھیں بچھانا دیکھئے
خاک میں مل کر بھی آنکھیں بند ہوں ممکن نہیں | راہ تیری صورتِ نقشِ کفِ پا دیکھئے
آپ سے دیکھی نہیں جاتی تھی میری زندگی | لیجئے مرتا ہوں اب مرنا تو میرا دیکھئے
کیا پیا پے چل رہا ہے دورِ صہبائے فنا | رنگِ ذوقِ محفل امواجِ دریا دیکھئے
خاک ہو کر بھی نہ چھوڑیں دامنِ محبوب ہم | دستِ مجنوں دیکھئے دامانِ صحرا دیکھئے
آپ سے جو پردۂ افلاک سے چھپتا نہ تھا | ہم نے سینے میں چھپا رکھا وہ جلوا دیکھئے

رات آسیؔ کہتے تھے اپنے سیہ خانے کو گور
جیتے جی مر جاتے ہیں عاشق تماشا دیکھئے

(۱۱۱)

ہاں یہ مانا کہ جو نکلے بھی تو مر کر نکلے
پر یہ حیرت ہے کہ اس کوچہ سے کیوں کر نکلے

آتے ہیں پیکرِ وہمی میں یہاں مثلِ حباب
نذرِ قاتل ہے اگر سر تہِ افسر نکلے

شمع کی طرح ہجوم آج ہے پروانوں کا
کیا وہ رکھے ہوئے سر پر کُلہِ زر نکلے

دیکھ کر حسنِ بتاں منہ سے نکلتا ہے درود
پھول بن کر مری نظروں میں یہ پتھر نکلے

وہ چلے چال کہ پامال ہے سارا عالم
جان تم بھی صفتِ چرخِ ستم گر نکلے

کوئے قاتل سے کروں میں سفرِ ملکِ عدم
کوئی رستا جو بسانِ دمِ خنجر نکلے

ہیں وہ مے نوش کہ لالے کی طرح خاک سے بھی
ہم چڑھائے ہوئے جامِ مئے احمر نکلے

کون یوسف کی طرح باغ میں بکنے آیا
کہ گل و غنچہ لیے مٹھیوں میں زر نکلے

دیکھ کر جنگِ سخن مصرعِ پُر آب مرے
مثلِ ابروئے صنم باندھ کے خنجر نکلے

پھر سیہ بخت ہی کہلاؤں سویدا کی طرح
دلِ روشن میں بھی بالفرض اگر گھر نکلے

تُرکِ چشمانِ صنم لڑ گئے آپس ہی میں
دونوں جانب سے بھویں کہتی ہیں خنجر نکلے

کوچۂ خاکِ دلِ خستہ دلاں کیا کہنا
اٹھو جس ذرّہ کو اُس کوچے میں دل بر نکلے

کیوں نہ مٹ جاؤں میں اے دل کہ وہ فرماتے ہیں
آؤں گھر میں ترے میں غیر جو باہر نکلے

آنسوؤں میں ہو کہاں عکس فگن حسن ترا
دل کے ٹکڑے مری آنکھوں سے مقرر نکلے

نیک سمجھا ہے کچھ افشائے سیہ کاریِ عشق
دیکھنا دودِ جگر منہ سے نہ باھر نکلے

وہ نسیمِ نفسِ صبح سے کھلاتے ہیں
کیوں یہ آہِ شبِ غم صورتِ صرصر نکلے

شکرِ محرومیِ آبِ حیوانِ لبِ یار
ہم سے درویش بھی ہم بختِ سکندر نکلے

باندھ دوں مژدۂ مرگِ شبِ غم کا نامہ
طائرِ جاں کہیں مانندِ کبوتر نکلے

دل ہی کھو بیٹھے جو سینے سے لگایا اُن کو
دل جنھیں سمجھے ہم افسوس وہ دل بر نکلے

حسرتِ کوچۂ محبوب میں کی باغ کی سیر
خار و گل دونوں نگاہوں میں برابر نکلے

یوں بتانے کے لیے عرش سے بھی دور بتا
تو سہی یار کہ پہلو میں ترا گھر نکلے

سب یہ جانیں کہ غزل آسیؔ مے نوش کی ہے
شعر جو نکلے وہ دامن کی طرح تر نکلے

طائرِ جان و دلِ آسیؔ شیدا دونوں
بلبلِ گلشنِ رُخسارِ پیمبرؐ نکلے

قطعہ

فنائے ہستئ عاشق وصالِ جاودانی ہے
ہماری جان کا دشمن ہمارا یارِ جانی ہے
کہاں مسکن، کہاں مدفن، کہاں ہنگامۂ محشر
ہوائے دولتِ دیدار میں کیا خاک چھانی ہے

فرد

پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم نہ چھیڑ ہمیں
ہم اور خاک میں مل جائیں گے اُٹھانے سے

۱

شہید ہوں چشمِ نرگسیں کا، نیازمند اپنے نازنیں کا
مزا ہے لب ہائے شکریں کا، ہے نام بس قند و انگبیں کا
نہ وصف پوچھو رخِ حسیں کا، نہ زلفِ پُر پیچ و تاب و چیں کا
یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا، کہ ہو خجل چاند چودہویں کا
جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا، سو ایک نافہ ہے مشکِ چیں کا

نہ بات میں کیوں ہو شانِ شیریں، بنی ہے مصری لسانِ شیریں
لکھوں[1] جو وصفِ لبانِ شیریں، قلم کے صدقے ہو جانِ شیریں
نہ کیسے[2] میرا بیانِ شیریں، ہو جوئے شہد روانِ شیریں
زبسکہ وصفِ دہانِ شیریں، رہا ہے وردِ زبانِ شیریں
بدن میں جب تک ہے جانِ شیریں، مزا دہن میں ہے انگبیں کا

چراغِ خور اس کے چہرہ سے گل، کمر رگِ گل ہے بے تامّل
زمین کو چال سے تزلزل، فلک کو پہونچا ہے گھنگرو کا غل
وہ روئے خنداں ہے جانِ بلبل، قدِ خراماں ہے سروِ صلصل
وہ چشمِ فتّاں ہے غیرتِ مُل، وہ زلفِ پیچاں ہے رشکِ سنبل
عذار میں ہے صباحتِ گل، بدن میں عالم ہے یاسمیں کا

---

[1] لکھیں [2] نہ کیوں ہمارا

فراق نے شمعِ مجلسِ غم، جلا رُلا کر کیا ہے ہر دم
ہو خاک جل کر تمام عالم، جو سوزِ دل سے بھریں کوئی دم
اُٹھائیں دامن جو آنکھ سے ہم، حباب کا ہو فلک میں عالم
یہ جوش پریاں ہے اشک کا یم، کہ ساتوں دریا ہیں قطرہ سے کم
جسے کہ کہتے ہیں سب جہنم، شرر ہے اک آہِ آتشیں کا

ہے سنبلِ موئے زلفِ حوراں، جگر میں جو جو ہے دودِ پیچاں
ہے نہرِ تسنیم چشمِ گریاں، تو رشکِ طوبیٰ ہے نخلِ حرماں
جسد کے گل ہائے زخمِ خنداں، نہ کس طرح ہو نصیبِ بُستاں
زبسکہ ہے جوشِ داغِ ہجراں، ہوا مرا سینہ باغِ رضواں
برائے گل گشت جائے غلماں، خیال پھرتا ہے اک حسیں کا

شیوالے پر قصد ہے ڈھئی کا، بتوں سے اب دم ہے بندگی کا
ہوا ہے اسلام جی سے پھیکا، مزا پڑا دل کو کافری کا
ہے تارِ سبحہ وبال جی کا، جنیو رشتہ ہے زندگی کا
بُرا ہو بدبخت عاشقی کا، نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا
بنا ہے عشقِ بتاں میں ٹیکا، نشانِ سجدہ مری جبیں کا

نہیں ہے زخمِ سنان و خنجر، کرے ہیں یہ آگ کے مقرر
بھرے ہیں کیا کیا شرار و اخگر، بجائے اوساخ اُن کے اندر
نہ ہو تو شرمندہ پھاہے رکھ کر، مجھے تو جرآح ہے یہی ڈر
اگر ہو پھاہا پرِ سمندر، تو[1] خاک ہو ایک دم میں جل کر
سُنا جو ہو آفتابِ محشر، کھرنڈ ہے داغِ آتشیں کا

ہے فوق مصرع کو کہکشاں سے، تو حرف ہیں سنبلِ جناں سے
نہ کیوں لڑے بیت لامکاں سے، عیاں ہے شانِ خدا یہاں سے
نہ پوچھو آسیِ بے نشاں سے، کہاں کو پہنچی غزل کہاں سے
طمع ہے انصافِ دوستاں سے، کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے، بلند تر رتبہ اس زمیں کا

---

[1] یقیں ہے ہو خاک

(۲)

میری مشکل کیجئے آسان یا مشکل کشا   آپ سے جانبر ہوئے سلمان یا مشکل کشا
ہے اجل کا سامنا ہر آن یا مشکل کشا   رات دن ہے رنج کا سامان یا مشکل کشا
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

آپ وہ ہیں نامرادوں کی جو دیتے ہیں مراد   آپ وہ ہیں جو دلِ ناشاد کو کرتے ہیں شاد
آپ وہ ہیں وقتِ مشکل جن کو سب کرتے ہیں یاد   غم کے ہم دستِ ستم سے مانگتے ہیں کب سے داد
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

آپ دریائے حقیقت کے دُرِ نایاب ہیں   موج مارے رحمتِ حق جس سے وہ سیلاب ہیں
کب سے مثلِ ماہیِ بے آب ہم بے تاب ہیں   بحرِ غم میں مبتلائے حلقۂ گرداب ہیں
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

"آپ ہیں دستِ دعا و بازوئے خیر البشر   دست و بازو کے تصدق لیجئے میری خبر
بارِ اندوہ و الم نے توڑ ڈالی ہے کمر   تیغِ غم نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے دل جگر
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

اے مسیحا کیوں نہ دردِ دل کروں اظہار میں   جانتا ہوں جانشینِ احمدؐ مختار میں
صدمۂ دل سہتے سہتے ہو گیا بیمار میں   ہائے کیسا ہو گیا ہوں ناتوان و زار میں
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

اشک خون آلود آنکھوں میں ہے چہرہ زرد ہے   آگ سینہ میں لگی ہے لب پہ آہِ سرد ہے
ہائے پہلو میں، جگر میں اور دل میں درد ہے   دیکھتی ہے چشمِ حسرت سے مجھے جو فرد ہے
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

سختیِ دل کس سے کہئے کون ہے کس کا ہے یار　　اب ڈھئی دیتا ہے سنگِ آستاں پر جاں نثار
مُردنی چھائی ہے منہ پر جی کو ہے جینے سے عار　　کچھ نہ کچھ صدمہ ہے دل پر ہیں جو آنکھیں اشک بار

کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

کشتیٔ ہستیِ اُمت کے تمہی ہو ناخُدا　　گردواب بیڑا ہمارا پار بہرِ مُصطفٰےؐ
نکلے اس منجدھار سے کس طرح یہ بے دست وپا　　پارہ پارہ دل کی کشتی کا ہے ہر تختہ جدُا

کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

کچھ نہیں معلوم کیسی آگ میں جلتا ہے دل　　اس طرح منہ سے نکلتے ہیں جو شعلے متصل
آفتابِ حشر ہے ہر داغِ حسرت سے خجل　　داغ اتنے ہیں کہ رکھ سکتے نہیں اب ایک تِل

کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

دم بہ دم ہاتھوں سے غم کے داد ہے بیداد ہے　　دیکھتے ہیں ہم بحسرت جس کی خاطر شاد ہے
کام ولب کو مشقِ آہ ونالہ وفریاد ہے　　تا بہ کے تڑپا کروں پہنچو دمِ امداد ہے

کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

ہائے قدموں سے جو لگتا ہوں کسی کے میں نزار　　اس کو مجھ سے اک خلش ہوتی ہے پیدا مثلِ خار
جس کے دامن سے لپٹتا ہوں کہیں میں خاکسار　　جھاڑ دیتا ہے وہ بے دردی سے بس مثلِ غبار

کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

کیا ہلائے دست وپا بحرِ الم کا آشنا　　گوہرِ مقصد کے غم میں آب ودانہ چھُٹ گیا
بلکہ نامِ آب ودانہ سے ہے ایسا جی بھرا　　گر گیا آنکھوں سے دانا موتیوں سا اشک کا

کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

کیا قلق وہ ہے جو رہ رہ کر ہلا دیتا ہے دل　　دل جو ہل جاتا ہے ہر زخمِ جگر جاتا ہے چھِل
آنسو آنکھوں سے گرے پڑتے ہیں اب یوں متصل　　پانی پانی ہے جھڑی ساون کی بادل ہیں خجل

کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

ہائے دل میں اور جگر میں شعلۂ غم ہے نہاں　　کچھ تو جلتا ہے جو سینے سے نکلتا ہے دھواں
منہ سے جو نالہ نکلتا ہے وہ ہے آتش فشاں　　آگ کا گویا زبانہ بن گئے کام و زباں
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

کچھ سمجھ کر ضبط کرتا ہوں جو آہِ دردناک　　چپکے چپکے دل ہی میں گھٹ گھٹ کے ہوتا ہوں ہلاک
سینہ پہلو دل جگر سب ہو گئے ہیں چاک چاک　　اب یہی باقی ہے صحرا کی اڑاؤں جا کے خاک
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

آپ ہیں شمعِ ہدایت یا امیر المؤمنین　　مبدءِ فیضِ ولایت یا امیر المؤمنین
نائبِ ختمِ رسالت یا امیر المؤمنین　　دیکھئے تو میری حالت یا امیر المؤمنین
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

میری حالت پر توجہ کی نظر فرمائیے　　شاہدِ مقصود کی صورت مجھے دکھلائیے
جو دلِ ناشاد کی امید ہے بر لائیے　　اب نہ آسیؔ کو بہت تڑپائیے غم کھائیے
کس مصیبت میں پڑی ہے جان یا مشکل کشا

(۳)

ہے اسی میں دلِ برہم زنِ تقدیر نہ کھینچ
مفت کرتا ہے غضب لانے کی تدبیر نہ کھینچ
اب بھی کہتا ہوں نہ کھینچ ادبِ بے پیر نہ کھینچ
پنجۂ شانہ سے تو زلفِ گرہ گیر نہ کھینچ
دل سے دیوانے کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

جز لحد اب نہیں آرام، وہ آئے بھی تو کیا
آچکا اور ہی پیغام، وہ آئے بھی تو کیا
جا چکا ہاتھ سے اب کام، وہ آئے بھی تو کیا
ہم تو بچتے نہیں تا شام، وہ آئے بھی تو کیا
اے دعائے سحری منتِ تاثیر نہ کھینچ

میں تو وہ ہوں کہ ہے ہر جزو یہاں نشۂ عشق
عنصر و کالبد و مایۂ جاں نشۂ عشق
پر سبک سر ہیں عدو اور گراں نشۂ عشق
اے ستم پیشہ مرے بعد کہاں نشۂ عشق
دیکھ خمیازۂ حسرت ہے یہ شمشیر نہ کھینچ

وہ مرض یہ تپِ دل ہے کہ خدا خیر کرے
کوئی دم جانِ حزیں دیکھئے دم لے کہ نہ لے
شیرۂ جاں سے بنے ہیں دہن و لب جس کے
ہے دوا میری وہی، سو نہیں ممکن کہ ملے
چارہ گر رنج و مصیبت پئے تدبیر نہ کھینچ

سیبِ جاں بخش ذقن جو نہیں ممکن کہ ملے
گو علاجِ تپِ دل ہو نہیں ممکن کہ ملے
مدعا اس سے یہ ہے گو نہیں ممکن کہ ملے
ہے دوا میری وہی سو نہیں ممکن کہ ملے
چارہ گر رنج و مصیبت پئے تدبیر نہ کھینچ

حال میں کون پریشان کے ہوتا ہے شریک
اہلِ غم کو کوئی پہچان کے ہوتا ہے شریک
کوئی ہو وجہِ طرب جان کے ہوتا ہے شریک
روزِ بد کون بھلا آن کے ہوتا ہے شریک
انتظارِ اثر اے نالۂ شب گیر نہ کھینچ

تو نے بے درد کبھی آکے نہ کی گرم بغل
کیا گوارا نہیں اس سے بھی جو دل جائے بہل
جیتے جی اس سے جدا کر کے نہ کر تو بے کل
اتنی فرصت دے ستم گر کہ پہونچ جائے اجل
دم کے دم اور بھی سینے سے مرے تیر نہ کھینچ

زہد و تقویٰ کے خیالات ہیں سب لاف و گزاف
غمِ دل کی نہ دوا کوئی کرے ہے انصاف
ہو مکدر کوئی آسیؔ کہے دیتا ہوں میں صاف
مومنؔ آکیش محبت میں کہ سب کچھ ہے معاف
حسرتِ حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ

۴

محالِ خرد ہے مثالِ محمدؐ — سرِ عرش تک پائمالِ محمدؐ
یہ پھیلا ہے نورِ کمالِ محمدؐ — جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ
دلم تازہ گشت از وصالِ محمدؐ

متاعِ نظر ہے وہ روئے دل آرا — انہیں کا دلِ ناتواں کو سہارا
مری آنکھیں ہوں اور ان کا نظارا — خوشا چشم کو بنگرد مصطفٰے را
خوشا دل کہ دارد خیالِ محمدؐ

عبث دردِ عصیاں سے تو کیوں کراہے — شفا اس مرض سے اگر اپنی چاہے
تو لازم ہے ذکرِ نبی میں نباہے — خوشا منزل و مسجد و خانقاہے
کہ در وے بود قیل و قالِ محمدؐ

بمدحش کلامِ خدا گشت نازل — بہ اخبارِ قربش دنیٰ گشت نازل
چو طٰہٰ و یٰسیں بسا گشت نازل — بوصفِ رخش والضحیٰ گشت نازل
چو واللیل شد زلف و خالِ محمدؐ

وہ روئے صفا خیز وہ زلف وہ تِل — ثنا سنج جن کا ہوا ربِ عادل
یہ ممکن نہیں وصف اُن کے ہوں اے دل — بوصفِ رخش والضحیٰ گشت نازل
چو واللیل شد زلف و خالِ محمدؐ

وہی نور ہے اصلِ ارکانِ عالم — انہیں نے بڑھائی ہے سب شانِ عالم
وہی جسمِ اطہر ہوا جانِ عالم — بروئے زمیں گشت سلطانِ عالم
کسے کو بود پائمالِ محمدؐ

کوئی عیشِ دنیا کی حسرت نکالے — کسی کو پڑیں باغِ جنت کے لالے
کوئی شمع رویوں ہی سے لَو لگالے — بود در جہاں ہر کسے را خیالے
مرا از ہمہ خوش خیالِ محمدؐ

خدا ہی مری حسرتِ دل نکالے — کہیں محوِ روئے محمدؐ اٹھالے
دلِ زار کو وقتِ آخر سنبھالے — بود در جہاں ہر کسے را خیالے
مرا از ہمہ خوش خیالِ محمدؐ

ہے فخرِ جہاں آسیؔ اُن کی غلامی — اسی میں کمالات کی ہے تمامی
نہیں رہتی ہے پختہ کاروں میں خامی — بصدق و صفائے چناں گشت جامی
غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ

۵

گئی جوانی اب آئی پیری نہ خشتِ زر سے دل آشنا کر
عوض میں نشہ کے تُل رہا ہے خمار آنکھوں میں تیری آ کر
نہ جا کے بت خانے میں ڈھئی دے نہ جم کے مے خانے میں رہا کر
نہیں ہوس وقتِ جوشِ مستی قدِ خمیدہ سے کچھ حیا کر
بتوں کا بندہ رہے گا کب تک خدا خدا کر خدا خدا کر

نہیں اب ایامِ خوابِ غفلت خیال اپنے مآل کا کر
اتر گیا نشۂ جوانی تو لطف کیا جامِ مے چڑھا کر
بڑھاپے نے گور سے لگایا لبوں پر اٹکی ہے جان آ کر
نہیں ہوس وقتِ جوشِ مستی قدِ خمیدہ سے کچھ حیا کر
بتوں کا بندہ رہے گا کب تک خدا خدا کر خدا خدا کر

مزا ہے الفت پرستیوں کا خدا پرستی یہاں کہاں ہے
تری نماز و عبادت اے دل حرم کے طاقوں میں رائیگاں ہے
جھکی ہیں نیچے وہ مست آنکھیں جو زیرِ ابرو تو یہ عیاں ہے
سجودِ محرابِ تیغِ قاتل عبادتِ رند مشرباں ہے
جو ہو سکے تو قضائے عمری اس ایک سجدے مں سب ادا کر

نہ ہے یہ منّت کشِ اقامت نہ اس کو کچھ حاجتِ اذاں ہے
حضورِ دل سے جو ہو ادا تو نماز اس ڈھب کی پھر کہاں ہے
سنو اگر دھیان سے تو بسمل کی ہچکیوں میں یہی فغاں ہے
سجودِ محرابِ تیغِ قاتل عبادتِ رند مشرباں ہے
جو ہو سکے تو قضائے عمری اس ایک سجدے میں سب ادا کر

فنا ہے سب کا نشان اک دن ہے نام باقی بس اک خدا کا
غبار برباد سب کے سب ہیں چلا قضا کا جو کوئی جھونکا
اگر ہو شبہ کسی کو اس میں تو ہائے مجھ کو بتا دو اتنا
کہاں ہیں جم اور کہاں سکندر کہاں سلیماں کہاں ہے دارا
یہ سب کے سب خاک کے تھے پُتلے بگاڑ ڈالے بنا بنا کر

کہاں ہے نل اب کہاں دمن ہے کہاں ہے یوسف کہاں زلیخا
کہاں ہے شیریں کہاں ہے خسرو کہاں ہے فرہاد بے ستوں کا
کہاں ہے مجنوں کہاں ہے لیلیٰ کہاں ہے وامق کہاں ہے عذرا
کہاں ہے جم اور کہاں سکندر کہاں سلیماں کہاں ہے دارا
یہ سب کے سب خاک کے تھے پُتلے بگاڑ ڈالے بنا بنا کر

جمھائی لے لے کے کہہ رہے ہو تو بہکی بہکی سی بات بھی ہے
جھکی ہیں پلکیں خمار کی کیفیت ہویدا کھُلی کھُلی ہے
جو مانو آسیؔ کہ سرخیوں سے لہو کی بوند آنکھ ہو رہی ہے
ہے منہ پہ بیداریوں سے زردی ہوس اگر نیند اچٹ گئی ہے
تصوّر اُس کے میں سو رہو تم بغل کا تکیہ لگا لگا کر

۶

حال جو کچھ ہے، ہجومِ موج پیچ و تاب میں — ماہیِ بے آب نے دیکھا نہ ہوگا خواب میں
کچھ نہ تھا غمِ اشک طوفاں خیز کے سیلاب میں — خوفِ جاں ہے عشقِ نافِ غیرتِ مہتاب میں
جا پڑی ہے کشتیِ عمرِ رواں گرداب میں

وہ بھی تو احباب ہی تھے جو لحد میں دھر گئے — تم عبث احوال اپنا آ کے برہم کر گئے
کیا ہوا جی سے اگر ہم عاشقِ مضطر گئے — جی گئے جو دل کی بے تابی سے غم میں مر گئے
ہے عیاں رنگِ مسیحا کشتۂ سیماب میں

مثلِ گل دستِ طلب زر سے ہوا کب آشنا — کب دُرِ مقصود مٹھی میں صدف آسا ملا
ہم تہی دستانِ قسمت پر عبث ہے افترا — تار ہائے چاکِ دامان و گریباں کے سوا
اور ہاتھ آیا ہمیں کیا عالمِ اسباب میں

ہجرِ سنگیں دل کی ہے مشقِ ستم آٹھوں پہر — ناک میں رہتا ہے بے تابی سے دم آٹھوں پہر
وقفِ حیرت کیوں نہ ہوں اے فرطِ غم آٹھوں پہر — بے قراری میں پڑے رہتے ہیں ہم آٹھوں پہر
رات کی بے تابیوں سے پَر لگے سُرخاب میں

کیوں نہ تڑپیں ہم سرِ خاکِ الم آٹھوں پہر — جب خوشی دم بھر نہ ہو اندوہ و غم آٹھوں پہر
ایک ساں ہے صدمۂ ہجرِ صنم آٹھوں پہر — بے قراری میں پڑے رہتے ہیں ہم آٹھوں پہر
رات کی بے تابیوں سے پَر لگے سُرخاب میں

وقت آخر جذبِ دل تاثیر دکھلائے کہیں — گو خزاں ہو پر نہالِ عشق پھل لائے کہیں
نزع کا وقت آگیا ایسے میں وہ آئے کہیں — حسرتِ دیدار ہے وہ بھی نکل جائے کہیں
ورنہ کچھ باقی نہیں اب عاشقِ بے تاب میں

•

بے ترے پاتا ہوں اسباب طرب جب روبرو — آنکھوں کے پیمانہ میں بھر بھر کے پیتا ہوں لہو
میں تو میں اب جانبِ چرخ کہن کر دھیان تو — ہر شب مہ ہجر میں اے ساقیِ خورشید رو
چشمِ گریاں کا ہے عالم ساغرِ مہتاب میں

ایک وہ ہیں جن کو دردِ ہجر کی ہیں شدتیں — ایک وہ ہیں جن کو خوابِ وصل کی ہیں راحتیں
اپنے اپنے بخت ہیں اور اپنی اپنی قسمتیں — بسملِ تیغ جدائی کی نہ پوچھو حسرتیں
دیکھ کر لپٹے ہوئے معشوق و عاشق ڈاب میں

ہو کے برہم کچھ نرالی وضع زلفوں کی ہوئی — فوجِ مارانِ سیہ جس طرح ہو امڈی ہوئی
ہر ادائے تازہ میں اک تازہ نیرنگی ہوئی — چشمِ مے گوں پر دہ زلف آئی تو یہ پھبتی ہوئی
ناگنی منہ ڈالے بیٹھی ہے شرابِ ناب میں

•

حاجتِ دل صاف میرے چہرہ سے ہے آشکار — ایک رنگ آتا ہے اک جاتا ہے دم میں لاکھ بار
چین لینے دیتی ہے بے تابیِ جانِ نزار؟ — نالہ بھی جو سر کیا میں نے وہ نکلا بے قرار
معدنِ سیماب ہے گویا دلِ بے تاب میں

دوستوں کی گل فشانی یاد کر کے روتے ہیں ان کی وہ رنگیں بیانی یاد کر کے روتے ہیں
غنچۂ یارانِ جانی یاد کر کے روتے ہیں صحبتِ عہدِ جوانی یاد کر کے روتے ہیں
کوئی بھی باقی نہیں اُس وقت کے احباب میں

کچھ نہ پوچھو کس طرح رو رو کے ہم جی کھوتے ہیں کیسے کیسے اپنے جاں پرور لحد میں سوتے ہیں
اس بڑھاپے میں انہیں باتوں کے صدمے ہوتے ہیں صحبتِ عہدِ جوانی یاد کر کے روتے ہیں
کوئی بھی باقی نہیں اُس وقت کے احباب میں

اور اس سے بھی سوا یہ عیش گھر آباد ہو آئے جو ناشاد اس دروازے پر وہ شاد ہو
مجھ سے محزوں پر مگر درباں کی کیوں بے داد ہو حاضرِ در میں رہوں یا جاؤں جو ارشاد ہو
آپ کیا کہتے ہیں اے جانِ جہاں اس باب میں

حُبِّ قربیٰ جب پیمبر کو ہوئی ہم سے مراد کیوں غمِ شبّیر و شبّر پر کرے کوئی عناد
آسیِؔ مغموم کو ہے یاد قولِ اوستاد خستگی سبطین کی اے افضلؔ آتی ہے جو یاد
روتے ہیں ذکرِ حدیثِ سیدِ اشباب میں

(۷)

وقتِ آخر ہیں تیرے مضطر کے　　نہ جیا کوئی عاشقی کر کے
یہی کہتا ہے آہیں بھر بھر کے　　کون جیتا ہے اے صنم مر کے؟
آؤ تو دیکھ لیں نظر بھر کے

چھپ کے لیناوہ ہائے تیرے قدم　　ٹھوکریں مارنا ترا پیہم
مر کے بھی اے صنم خدا کی قسم　　سر کو ٹکراتے ہیں لحد میں ہم
لطف بھولے نہیں ہیں ٹھوکر کے

ہائے کیا مے کشی کو چاہے جی　　اب تو خواہش نہیں ہے جینے کی
جامِ مے نے یہاں جو گردش کی　　ساقیا چشمِ یار یاد آئی
دے مجھے ساغرِ اجل بھر کے

کوئی ہے عشق باز اس میں گڑا　　اس لحد پر جو کان رکھیئے ذرا
یہی آتی ہے دردناک صدا　　منہ دکھانے کا کس نے وعدہ کیا
منتظر ہیں جو روزِ محشر کے

سر فدا کرنے کی جو حسرت تھی　　آتشِ شوقِ قتل تھی بھڑکی
گردن اُس نے جو اے جنوں کاٹی　　کیا بھائی ہمارے دل کی لگی
صدقے اُس آب دار خنجر کے

ہجر میں بہرِ و اشدِ دلِ زار　　گئے سیرِ چمن کو آخرِ کار
گل[1] یہ پھولا کیا وہاں ہر بار　　یاد آیا چمن میں جب قدِ یار
صدقے ہونے لگے صنوبر کے

دیکھ تو اپنے بے نوا کی طرح　　تیرے کوچے میں ہے گدا کی طرح
کہہ رہا ہے کھڑا صدا کی طرح　　خاکساری میں نقشِ پا کی طرح
رہ نما ہیں ہر ایک رہبر کے

ارے سنتا ہے او دلِ شیدا　　تالیوں کی کچھ آرہی ہے صدا
ہوش کیوں اڑ گئے ہیں آنکھ اٹھا　　نامہ اُس طفل کو مگر پہونچا
جو کبوتر وہاں اڑے پر کے

ہے[2] لطافت میں جوئے شیر یہ بحر　　ہوئی آسیؔ کو دل پذیر یہ بحر
نہ سمجھنا کہ ہے حقیر یہ بحر　　کرے طوفاں بپا وزیر یہ بحر
لکھوں مضموں جو دیدۂ تر کے

---

[1] اک نیا گل کھلا۔ [2] رکھتی ہے آبِ نوکِ تیر یہ بحر

(۸)

در ہجرت اے خیرالبشر دل را مداوا چوں کنم
خونِ تمنا سربسر در جوشِ سودا چوں کنم
شوقِ رُخِ گل ہائے تر بے روئے زیبا چوں کنم
روئے تو غائب از نظر گل را تماشا چوں کنم
چوں لالہ داغم بر جگر گل گشتِ صحرا چوں کنم

سوزِ غمت اے جانِ جاں بگداخت مغزِ استخواں
از دل نیابی بے گماں جز مشتِ خاکستر نشاں
با دیدۂ آتش فشاں بر ہر زمین تا آسماں
مثلِ تو جویم ہر زماں تا باشدم آرامِ جاں
بے مثل بودی در جہاں مثلِ تو پیدا چوں کنم

نالاں بہ ہر شہر و دہم ننگِ ہدف تیرِ زہم
نایَد نظر روزِ بہم حنظل بود سیب و بہم
شد یار از کہ تا مہم نکشود کا از دستِ ہم
گیرم بلب مہرے نہم کز نالہ و افغاں رہم
دل را صبوری چوں دہم جاں را شکیبا چوں کنم

شیدائے رویت ہر چمن گل ہا چو بلبل نعرہ زن
مژگاں بدل نشتر فگن بعلت بجاں آتش فگن
اے غیرتِ جانہا ز تن جانی تو و عالم بدن
نے بے تو برگِ زیستن نے مرگ من در دستِ من
اکنوں بکارِ خویشتن حیرانم آیا چوں کنم

باشد بتِ رنگیں ادا گل پیرہن گل گوں قبا
لبہاش لعلِ جانفزا دنداں چو دُرِّ بے بہا
ہر چند باشد مہ لقا یا رشکِ مہرِ پُرضیا
حاشا کہ من غیرِ ترا سازم درونِ سینہ جا
خود گو بجائے آشنا بیگانہ را جا چوں کنم

۹

برنگِ خود چہ بسپردی مرا در دستِ حیرانی
سوئے مسجد بری گاہے گہے در دیر برسانی
اگر می پیچدت در سر ہوائے قربِ ربّانی
بدہ دستِ یقیں اے دل بدستِ شاہِ جیلانی

کہ دستِ او بود اندر حقیقت دستِ یزدانی

ندانم تا چہ شانے دارد آں سلطانِ جیلانی
نیفتد مشکلے اے دل کہ نکشاید بہ آسانی
بدینِ احمدی کردہ کہ عیسائی نمی دانی
امیرِ دستگیرِ غوثِ اعظم قطبِ ربّانی

حبیبِ سیدِ عالم زہے محبوبِ سبحانی

نہ شد معلومِ ما ہرگز شہنشاہا چہ سلطانی
کہ فخرِ ہر ملک باشد بدرگاہِ تو دربانی
جمالِ احمدی دیدم بتو یا شاہِ جیلانی
کہ می گوید ترا در حسن و خوبی یوسفِ ثانی

کہ او محبوبِ یعقوب است و تو محبوبِ سبحانی

چو دو ناں تا بہ کے اے دل بہ بندِ حرصِ نفسانی
دوی حیراں بہر سوئے مگر تو سخت[1] نادانی
گہے ظلِّ ہما جوئی گہے تختِ سلیمانی
سگِ درگاہِ جیلاں شو چو خواہی قربِ ربّانی

کہ بر شیراں شرف دارد سگِ درگاہِ جیلانی

[1] نیک

بنورِ مقدمِ او شد فروغِ تازہ ایماں را
خمِ ابروئے او محرابِ طاعت ہر مسلماں را
بجائے مردمک شد خاکِ پایش جن و انساں را
بہ فیضِ مقدمش فخرِ ابد شد پاک بازاں را

حیاتِ تازہ بگرفتہ از و دینِ مسلمانی

درونِ سینہ تا دارد غمِ عشقِ تو افزونی
بروں کردم ز دل یکسر ہوا و حرص بیرونی
مقامِ تو چہ داند کس مپرس از من کہ تو چونی
نشانِ شانِ بیچونی بیانِ سرِّ مکنونی

بہ صورت مثلِ پیغمبر بہ سیرت حیدرِ ثانی

گدائے حضرتِ جیلاں بہ گردوں فرق فرساید
سلاطیں گر بدرگاہش جبیں سایند می شاید
در آید از درِ خدمت ز آسیؔ ایں کجا آید
نیازؔ اندر جنابِ پاکِ او از قدسیاں باید

کہ آید جبرئیل از بہرِ کاروبارِ دربانی

مثلث

۱
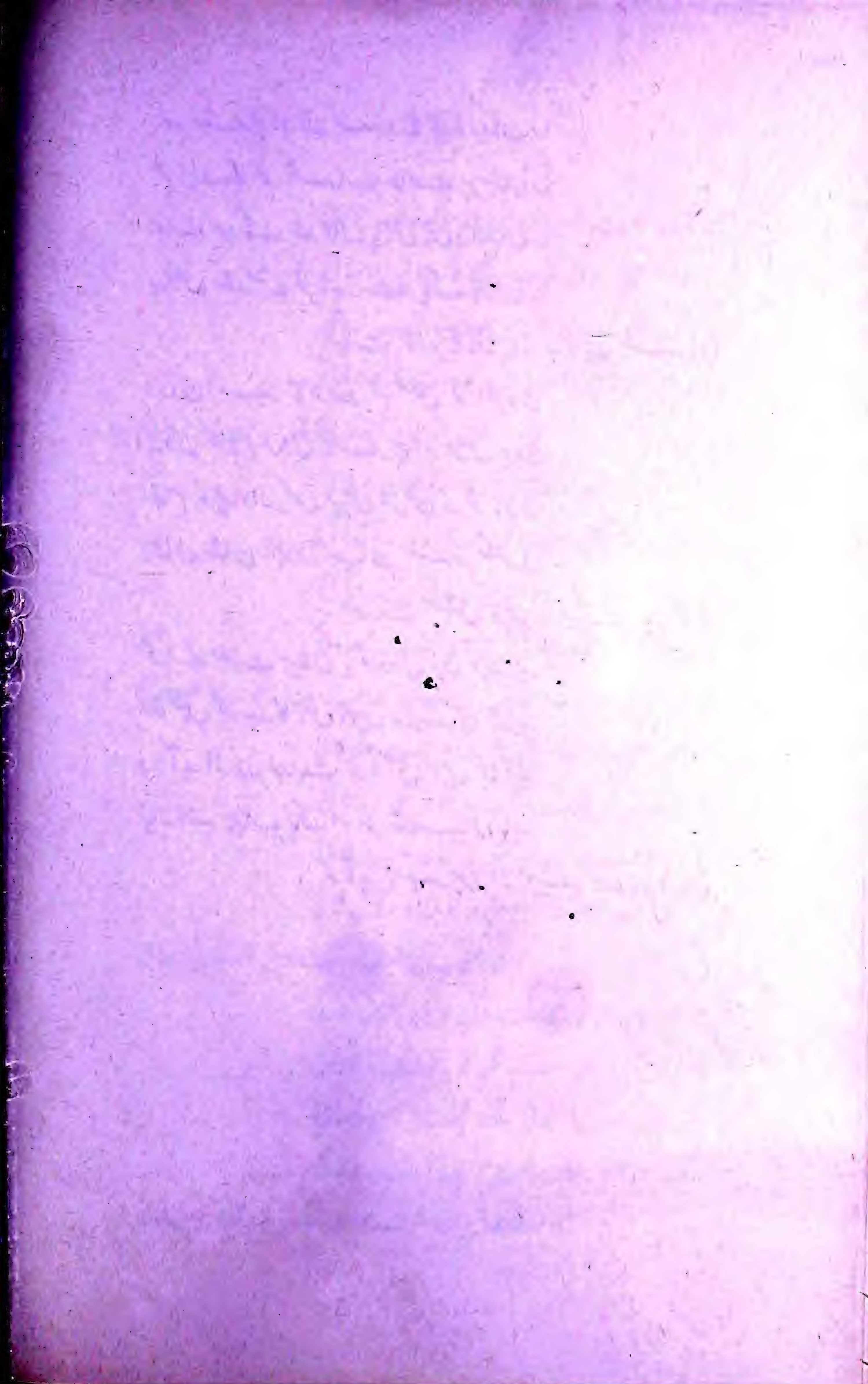
بس میں جی ہے نہ دل قابو میں   آنکھیں ڈوب رہی ہیں لہو میں
ہے ہے یار نہیں پہلو میں

خاک جدائی میں ہم سوئے   چھاتی کوٹ کے اتنا روئے
دل کے ٹکڑے گرے آنسو میں

کیا کہتے ہو دل کو تھامو   دل اب پاس کہاں ہے یارو
جا الجھا وہ اِک گیسو میں

سینے میں جو گرمی بھڑکی   ایسی زباں میں آئی خشکی
کانٹے پڑ گئے ہیں تالو میں

پلکیں دل میں کٹاری ماریں   صاف بھویں ننگی تلواریں
آنکھیں دونوں بھری جادو میں

دیکھو اپنا اپنا گہنا   بیڑی طوق تو ہم نے پہنا
جوشن اُن کے وہاں بازو میں

پلکوں نے وہ نیش لگایا سینا چھید کے باھر آیا
ایسا ڈنک کہاں بچھو میں

تیرے لیے اے جانِ عالم دھوپ میں مارے پھرتے ہیں ہم
پاؤں بھلستے ہیں بالو میں

گلشن گلشن جا کر دیکھا لیکن ہم نے کہیں نہیں پایا
تجھ سا گل کوئی رنگ و بو میں

اپنی روش ہے حسن پرستی مذہب کیسا، ملت کیسی
مومن میں ہیں نہ ہم ہندو میں

تم تو آسی منہ کو نہ کھولو جو وہ کہیں چپکے[1] سے سن لو
بات بڑھے گی گفت و گو میں

---

[1] بس چپکے

(۲)

جوؔ آنا ہو تو آجاؤ نہیں اب جان جاتی ہے
بھج پھڑکت ہیں تورے ملن کو سرون سنن کو بین
من مالا تو ہے نام کا جپت رہت دن رین
خبر لو آتشِ شوق آگ اب دل میں لگاتی ہے
کر کپنے نکھنی ڈگے انگ انگ تھترائے
سُدھ آوت چھاتی پھٹے پاتی لکھی نہ جائے
مصیبت ہجر کی راتوں کی کب لکھنے میں آتی ہے
من ماں راکھوں من جرے کہوں تو مُکھ جر جائے
گونگے کا سپنا بھیو سمجھ سمجھ پچھتائے
مقامِ گومگو ہے سوزشِ غم جی جلاتی ہے
ہم تم سامی ایک ہیں کہن سنن کو دوے
من کو من سے تولئے دو[2] من کبھی نہ ہوے
ملا جب دل سے دل پیارے دوئی پھر کب سماتی ہے
کاجر دوں تو کرکرائے سُرما دیا نہ جائے
جن نینن ماں پیو بسیں[3] دوجا کون سمائے
پری بھی ہو تو نظروں میں ہماری کب سماتی ہے

---

[1] مثلث بر دوہۂ ہندی [2] تو دو من [3] پیا بست ہیں

نین رکت پاتی لکھوں جو بس ہوئے ہمار
اچھتر بن کاگد چڑھوں دیکھوں درس تُہار
عجب خونِ جگر یہ بے بسی ہم کو کھلاتی ہے

میں چاہوں کہ اُڑ ملون اور پر بِن اڑا نہ جائے[1]
کا کہوں کرتار کو جو پر نا دیا لگائے
کوئی تدبیر ملنے کی نہیں ہم سے بن آتی ہے

آؤ پیارے درگھن میں[2] نین موند تو ہے لوں
نا میں دیکھوں اور کو نا تو ہے دیکھے دوں
یہ حسرت جی کی جی ہی میں ہمیشہ رہتی جاتی ہے

اوس اوس سب کوؤ کہے آنسو کہے نہ کوئے
منھ برہن کے سوگ میں رین رہی ہے روئے
مرے روزِ سیہ پر رات بھی آنسو بہاتی ہے

گھونگھچی بن ماں دیکھ کے کیسی بوجھی بات
برہنی ڈوبی رکت میں اور سیس جات اُترات
شہادت تیرے کشتوں کی بھی کیا کیا رنگ لاتی ہے

آئے وہ دن گھٹ گئے کہ رہت رہے پیو پاس
اب پیو سپنا ہو گئے کہ نت چت رہت اُداس
نہ کچھ پوچھو جدائی اس کی اب کیا کیا ستاتی ہے

---

[1] جائے [2] میں میں نینن موند

راگ کٹھن سب راگ ہیں برہ راگ بیراگ
تل دھرنے کی ٹھور نہیں اور دیت داگ پر داگ

بناؤں لالہ زار اپنا جگر میری ہی چھاتی ہے

اٹھا بگولا پریم کا اور تنکا چڑھا اکاس
تن کا تھا سو تن میں ملا اور تنکا تنکے پاس

نسیمِ کوئے جاناں اب مری بھی خاک اڑاتی ہے

سائیں بھروسا جان کے پاپ کیا بھرموٹ
جیسے نار کو کرم کرے اور چھپے پیا کے اوٹ

اُمیدِ مغفرت آسیؔ مجھے عاصی بناتی ہے

سلام

①

اے جانِ جاناں میں فدا — اے صبحِ پنہاں میں فدا
اے نورِ رحماں میں فدا — اے سرِّ سبحاں میں فدا
سلطان میرے میں فدا — مہمان میرے میں فدا
ایمان میرے میں فدا — اے جان میرے میں فدا
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

اے میرے آقا السّلام — اے میرے مولا السّلام
امت کے شیدا السّلام — رحمت کے دریا السّلام
میرے مسیحا السّلام — میرے دل آرا السّلام
نورِ سویدا السّلام — جانِ تمنا السّلام
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

پیدا ہوئے پیدا ہوئے — خیرالوریٰ پیدا ہوئے
نورِ خدا پیدا ہوئے — دل کی دوا پیدا ہوئے
بحرِ سخا پیدا ہوئے — ابرِ عطا پیدا ہوئے
دُرِّ صفا پیدا ہوئے — موجِ وفا پیدا ہوئے
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

شمس الضُّحیٰ پیدا ہوئے — بدر الدّجیٰ پیدا ہوئے
نور الہدیٰ پیدا ہوئے — نجمِ ضیا پیدا ہوئے
کہف الورٰی پیدا ہوئے — صدر العُلیٰ پیدا ہوئے
کیا مہ لقا پیدا ہوئے — کیا مہ لقا پیدا ہوئے
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

شاہِ شہاں پیدا ہوئے — جانِ جہاں پیدا ہوئے
گنجِ نہاں پیدا ہوئے — تاجِ جہاں پیدا ہوئے
گردوں مکاں پیدا ہوئے — عالی نشاں پیدا ہوئے
مطلوبِ جاں پیدا ہوئے — کیا دلستاں پیدا ہوئے
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

شاہِ زمیں پیدا ہوئے — سردارِ دیں پیدا ہوئے
صاحب نگیں پیدا ہوئے — مسند نشیں پیدا ہوئے
مہرِ مُبیں پیدا ہوئے — نورِ یقیں پیدا ہوئے
کیا مہ جبیں پیدا ہوئے — کیا نازنیں پیدا ہوئے
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

شاہِ عرب پیدا ہوئے — ماہِ طرب پیدا ہوئے
عالی نسب پیدا ہوئے — والا حسب پیدا ہوئے
جانِ طلب پیدا ہوئے — کانِ ادب پیدا ہوئے
اُمّی لقب پیدا ہوئے — محبوبِ رب پیدا ہوئے
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

خیر البشر پیدا ہوئے — نیکو سیر پیدا ہوئے
تیغِ ظفر پیدا ہوئے — غم کے سپر پیدا ہوئے
رشکِ قمر پیدا ہوئے — روشن گہر پیدا ہوئے
معجز نظر پیدا ہوئے — نازک کمر پیدا ہوئے
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

کیا نور کا انسان ہے — اللہ تیری شان ہے
سب جسم ہے یہ جان ہے — چہرہ نہیں قرآن ہے
یہ دین ہے ایمان ہے — میرا یہی سلطان ہے
جو ہے یہاں حیران ہے — جی جان سب قربان ہے
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

ہیں سُرمگیں آنکھیں غضب — اعجاز سے توام ہے لب
گیسو میں تاریکیٔ شب — رخسار میں انوارِ رب
پلکوں میں ہیں تیروں کے ڈھب — چتون نہیں جادو ہے سب
ابرو مہِ عیدِ طرب — ایسا کوئی ہوتا ہے کب
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

کیا نرگسِ بیمار ہے — کیا ابروئے خم دار ہے
کیا طُرّۂ طرّار ہے — کیا چاند سا رخسار ہے
کیا نور کیا دیدار ہے — یوسف یہاں بیکار ہے
تسخیر جانِ زار ہے — جو ہے سو دل افگار ہے
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

کیوں کر انہیں کہیئے بشر — نورِ خدا ہے جلوہ گر
ہوں گے یہ وہ رشکِ قمر — شق چاند کا ہو گا جگر
اشجار دوڑیں حکم پر — تسبیح پڑھ دیں گے حجر
گزریں گے آسی یہ جدھر — بس جائے گی وہ رہ گزر
اے میرے سرور میں فدا — میرے پیمبر میں فدا

(۲)

سلامِ خدائے زمین و زماں — نثارِ سرِ سیّدِ مُرسلاں
سلامِ مسلسل چو زلفِ پری — نثارِ سرِ چترِ پیغمبری
سلامِ صفا خیزِ آبِ حیات — فدائے جنابِ شہِ کائنات
سلام اے دوائے دلِ دردمند — سلام اے شب افروزِ چرخِ بلند
سلام اے شفا بخشِ دردِ نہاں — سلام اے مسیحائے دل خستگاں
سلام اے گُلِ گلشنِ اصطفا — سلام اے نسیمِ بہارِ صفا
سلام اے سفر کردۂ لامکاں — سلام اے مکینِ دلِ عاشقاں
سلام اے مرے غم کے تم غم گسار — سلام اے گنہ گار اُمّت کے یار
سلام اے خدا سے مرے عذرخواہ — سلام اے مرے تم شفیعِ گناہ
سلام اے مرے درد کے چارہ ساز — مرے روح پرور مرے دل نواز
سلام اے رسولِ فلک بارگاہ — مرے بندہ پرور مرے بادشاہ
سلام اے سحابِ مطیرِ کرم — کریمُ السّجایا جمیلُ الشّیَم
سلام اے تجلیِ نورِ قدم — نبی البرایا شفیعُ الاُمم
سلام اے حبیبِ خدائے علیم — قسیمٌ جسیمٌ نسیمٌ وسیم
سلام اے شہِ روزِ امید و بیم — شفیعٌ مطاعٌ روفُ الرّحیم
سلام اے رسولِ خدائے کبیر — سراجٌ منیرٌ بشیرٌ نذیر
سلام اے نبیِ بلیغ و فصیح — حسینٌ جمیلٌ صبیحٌ ملیح
سلام اے دلیلِ رہِ مستقیم — حبیبٌ جلیلٌ خلیلٌ کریم

سلام اے امامِ نبی و ولی　　تقیؒ نقیؒ صفیؒ وفی

سلام اے مرے دلستاں السلام　　سلام اے مرے جانِ جاں السلام

سلام اے دُرِ تاجِ دیں السلام　　سلام اے سرِ مرسلیں السلام

سلام اے مرے پیشوا السلام　　سلام اے مرے مقتدا السلام

سلام اے حبیبِ خدا السلام　　سلام اے شہِ انبیا السلام

سلام اے دلِ عاشقِ خستہ دل　　نہ رکھ ماسوا میں مجھے پا بہ گل

مئے عشق سے اپنے سرشار کر　　نہ پھر کچھ رہے پاؤں سر کی خبر

یمین و یسار و درون و بروں　　بس اِک آپ کا جلوہ دیکھا کروں

کروں جس طرف چشمِ نم ناک وا　　نظر کچھ نہ آئے تمہارے سوا

تڑپ کر نہ حسرت سے ہرگز مروں　　تمہیں دیکھتے دیکھتے جان دوں

لحد تک تمہاری محبت کے ساتھ　　چلا جاؤں دنیا سے راحت کے ساتھ

یہ جلوے تمہارے جو گھیرے رہیں　　نہ کونے لحد کے اندھیرے رہیں

نہ مرکر بھی ہو نشۂ عشق دور　　وہاں بھی رہوں میں محبت میں چور

وہاں بھی یہی نعرہ مارا کروں　　محمدؐ محمدؐ پکارا کروں

قیامت کے دن جب اٹھوں خاک سے　　لپٹ جاؤں میں دامنِ پاک سے

نہ جنت کی خواہش نہ دوزخ سے ڈر　　رہے آپ کا جلوہ پیشِ نظر

تمنا نہیں دل میں اس کے سوا

علیک الصلوٰۃ اے نبی الورٰی

قصیدہ

در مدحِ نواب کلب علی خان بہادر والی رام پور

کہاں ترا کوئی بحرِ وجود میں ثانی | حباب دیدۂ اہلِ نظر میں ہے پانی
نہ فرق سوجھے اگر ظاہر و مظاہر میں | کسے کہے کوئی باقی کسے کہے فانی
اسی کو دیکھتے ہیں جمع بلکہ جمع الجمع | جسے سمجھتے رہے مدتوں پریشانی
ہوا جو رفعِ تعین تو جز بہار نہ تھا | یہ برگ و بار و گل و غنچۂ گلستانی
کہے بہار لبِ گل سے "میں بہار" تو کیا | یہ شورِ کشتنِ منصور وائے[1] نادانی
درخت پھل سے ہے پیدا تو ہے درخت میں پھل | یہ میری تیری ہے پیدائی اور پنہانی
اگر یہ ہم ہیں تو کیا تیری ذات ہے محدود | اگر یہ تو ہے تو کیا پھر وجودِ امکانی
اگر یہی ہے تو وہ شوقِ دید کس کا تھا | جوابِ تند سے کی کس نے شعلہ افشانی
مخل نہ جب ہوئی وحدت میں کثرتِ عالم | تو کیوں شریکِ قدم ہو ثبوتِ اعیانی
زوالِ صورتِ اشیا ہے صورتِ ہمہ اوست | غرض کہ ہیچمدانی ہوئی ہمہ دانی
مآلِ سعیِ نگاہِ کمالِ تحقیقات | ق | نہ خاک کچھ نظر آیا بغیر حیرانی
اخیر یہ کہ نہ پہچاننے کے قالب میں | وہ ذاتِ پاک گئی آشنا سے پہچانی
مجھے امید سکون و قرار کیا اُس سے | جو اپنے جلووں کو رکھتا ہو آنی و فانی
ابھی تو وجد میں لاتا ہوں عقلِ اوّل کو | وہ چھیڑتا ہوں میں آہنگِ مطلعِ ثانی
زہے طراوشِ جوشِ شیونِ احسانی | مطلع دوم | ظہورِ[2] خاص کو خوش آئی وضعِ انسانی
حبابِ گنبدِ گردوں میں یہ اشارہ ہے | ہوا کی طرح ہے آنا تیرا یہاں آنی

---

[1] ؟ [2] ان اللہ خلق آدم علےٰ صورتہ

جو ایک ذکر میں سو گردشیں نہ دے دل کو — وہ کیوں عبث کرے بدنام سبحہ گردانی

بڑھا جو شعلہ میرے جسم زار سے لپٹا — فدائے شمعِ تجلی ہوئی وہ عُریانی

خدا نے بخشی ہے صحبت کو[1] بڑی تاثیر — سرو ہی آنکھوں میں ہے سرمۂ صفاہانی

شگافِ سینہ سے جھانکو تو بھوک پیاس ہو بند — ہر ایک داغِ غمِ دل ہے ماہِ کنعانی

جو خاکسار ہو اپنی جگہ سے کیوں اُٹھے — کہ اُٹھ کے مثلِ غبار اس کو ہو پریشانی

برنگِ لالہ کہاں خونچکاں زبان ملے — جو کوئی عرض کرے سوزِ داغِ پنہانی

میں ابتدا ہی میں ان نالوں کو یہ کہتا تھا — کہ بہر گوئے فلک یہ کریں گے چوگانی

بس ایک دم کے لیے سربلند دیکھ لیا — مگر حباب بھی تھا کوئی تاجِ سلطانی

نہ چھوڑے گا روشِ راستی کو آزادہ — کہ میلِ راہِ ہدایت ہے سروِ بستانی

ضرور روئے بتاں میں کچھ اور جلوہ تھا — ہے چشمِ آئینہ آئینہ دارِ حیرانی

خدا کے واسطے اے شمع اب بھی کہنا مان — کرے گی بھور ترا تیری اشک افشانی

وہ طوطیٔ شکرستانِ ہند ہوں آسی — کہ گم[2] ہو ناطقۂ صائبِ صفاہانی

میرا کلام وہ مُعجز جو پڑھ کے اِک مصرع — دہانِ گُنگ میں پھونکوں کرے غزل خوانی

غزل

نہ جان دے کے بھی ہم سمجھے وائے نادانی — کہ تھا وہی لبِ جاں بخش دشمنِ جانی

بچی بھی تھی کہیں بختِ سیاہِ عاشق سے — غلط ہے گیسوئے شب رنگ کی پریشانی

میں نقشِ پا کی طرح پائمال و خاک بسر — وہاں ہنوز وہی تہمتِ تن آسانی

خیالِ غیر ادھر آیا کہ مار دی گولی — غضب کی مردمِ دیدہ نے کی نگہبانی

بغیرِ منزلِ حیرت کہاں نظارۂ یار — نویدِ یاس ہوئی آئینہ کی حیرانی

---

[1] غالباً (بھی)، [2] ہو بند

ہمارے زخمِ جگر اور اس طرح مرجھائیں — وہ کیا ہوئی تری زلفوں کی مشک افشانی

نہ داغ سینے میں پیدا نہ دل میں دھیان ترا — تو کس نے چاکِ گریباں کیا ہے نورانی

بھلا تم اپنی انگوٹھی تو ہاتھ میں ڈھونڈو — عدو سے دیو کریں دعوئ سلیمانی

تمہیں نہ دل میں چلے آؤ دیکھ لو سب حال — نہیں ہے قابلِ اظہار دردِ پنہانی

وہ اپنی زلفیں کہاں تک بنائیں گے آخر — ہماری رات ہے زلفوں سے ان کی طولانی

نہ چھوڑ بہرِ خدا اے خیالِ موئے کمر — ہمارے دیدۂ داغِ جگر کی مژگانی

ترے تصوّرِ روئے نکو نے کھول دیا — کہ دل کے شیشہ میں تھی قوّتِ پرستانی

کسی کے سُرمۂ دنبالہ دار نے آ سَنی — سیاہ مست کو دی مے کدے کی دربانی

پڑھوں صدائے حزیں سے وہ خونفشاں مطلع — کہ بزمِ عرضِ سخن ہو تمام افشانی

دلِ گرفتہ ہے اے دل نویدِ عریانی — مطلع سوم — کہ غیر چاک نہیں غنچے کی گریبانی

سیاہیِ شبِ غم کا نہ کیوں ہوں شکر گزار — شبِ لحد نظر آتی ہے مجھ کو نورانی

میں اس کی رزق رسانی کی شان کے صدقے — نہ اور کچھ ہو تو غم ہے غذائے روحانی

نہ خاک کچھ ہوئی تاثیر سخت جانی میں — بھلا جگر کو کیا زہرِ غم نے کیا پانی

یہ سادگی کہ میں اس بحرِ غم کی ڈھونڈوں تھاہ — ہو جس کے قطرے میں کشتیِ نوح طوفانی

بجائے آب ہے زہرابۂ الم دن رات — غذا کے بدلے وہی دل جگر کی بریانی

ظہورِ غم تو کچھ اسباب کا نہیں محتاج — بغیر چشم ہے شبنم کی اشک افشانی

جو آفتابِ قیامت نہیں تو کیا ہیں یہ داغ[1] — کہ اُن کے دم سے شبِ غم کی ہے چراغانی

وفورِ اشک میں ماوائے غم نہ دل ہوتا — جو ہوتی لازمِ سیلاب خانہ ویرانی

---

[1] یہ داغ دل کے مرے آفتابِ محشر ہوں ؎ انہیں کے دم سے شبِ غم کی ہے چراغانی

یہ زیرِ چرخِ تنک ظرف جوششِ یم غم — یہ اک حباب میں بحرِ بلا کی طغیانی
کہاں فلک نے بھرے سیم و زر سے ہاتھ اپنے — ہماری قدر مہ و مہر سے بھی کم جانی
مرا نوشتۂ تقدیر وہ سیہ نامہ — کہ بہرِ خواب کرے بخت کی شبستانی
جز اغنیا نہ ہو مفلس کے درد کا گاہک — ق — گراں بہا ہے غمِ جاں گزا کی ارزانی
ہوائے صدقِ ابوبکرؓ و سوزِ عشقِ عمرؓ — خمیر کے لیے آبِ حیائے عثمانیؓ
جہانِ ولولۂ بوتراب کی خاک[1] — نہ پوچھ کس کے عناصر ہیں ایسے نورانی
وہ کون پاک گہر پاک منظر ایسا ہے — خجستہ روئے ملک خوئے یوسفِ ثانی
سپہرِ کوکبہ نوابِ آفتاب جناب — جنابِ کلبِ علی خاں محبِّ سبحانی
اگرچہ جذبِ دلِ زار کھینچتا ہے اُدھر — پکڑ کے دستِ ارادت سے موئے پیشانی
میں خاکِ جادۂ ایماں وہ قبلۂ ایماں — رجوع اُس کی طرف عین حُبِّ ایمانی
مگر خدا نے کیا ہے مجھے وہ خاک نشیں — اُٹھا جگہ سے کہ ہوں مثلِ نقشِ پا فانی
برائے سیر رہِ برّ و بحر ظاہر ہے — میں بحرِ شعر میں کرتا ہوں سیرِ پنہانی
نگاہِ اہلِ حقیقت میں قربِ جسمی سے — اتم و اکمل و اشرف ہے وصلِ روحانی
حضور میں یہ زمیں بوس ہو کے عرض کروں — کہ اے فدائے جمالِ تو انسی و جانی
مطلع چہارم
ترا جمال جمالِ کمالِ نفسانی — ترا خیال کمالِ خیالِ انسانی
ترا فراق فراقِ سعادتِ ابدی — ترا وصال وصولِ عروجِ امکانی
ترا کرم کرمِ حق کی دل رُبا تصویر — ترا غضب غضبِ کردگار کا بانی
ترا کمال مہِ آسمانِ جلوۂ ذات — ترا کلام جہانِ رموزِ عرفانی
تری ثنا ہوئی سرمایۂ کمالِ ثنا — ثنا پر آپ ہے واجب تری ثنا خوانی
تری یہ محویت اللہ ذکرِ سبحاں میں — کہ تیرے سجے سے نکلے صدائے سُبحانی

[1] (غالباً) ہے خاک

ولائے حق تری رگ رگ میں ریشہ ریشہ میں
فلاسفہ جسے سمجھیں حلولِ سریانی

خدا کی رحمتِ پیہم تری محیطِ وجود
یہ پائی میں نے مثالِ حلولِ طریانی

دلیلِ شوکتِ ایماں ترے زمانے میں
برنگِ زُلفِ بُتاں کفر کی پریشانی

برائے نصرتِ سالک صدائے امر تری
فغانِ زنگلۂ کاروانِ حق دانی

گناہ گاروں میں شورِ نہیبِ نہی ترا
نمک فشانیِ جامِ شرابِ ریحانی

ترا وہ عدل کہ نوشیرواں پئے تقلید
ازل ہی میں تجھے سمجھا امامِ روحانی

ترا فدائے سرِ بذل گوہرِ شہوار
ترا گدائے درِ فیض ابرِ نیسانی

خدا کرے کہ ترے دستِ جُود سے ہو خجل
ہمارے پنجۂ مژگاں کی گوہرافشانی

وہ تیری ہی نہ گہر ریزیوں کے جلوے ہوں
بھری جو دیکھی ثریا کی رات ہمیانی

وسیع سینۂ عارف سے صحنِ خانہ ترا
بلند ہمّتِ عاشق سے اوجِ ایوانی

وہ تیری خلوتِ راحت میں ہر در و دیوار
کہ جوشِ بالِ پری ہو پئے مگس رانی

ترا وہ جلوۂ حُسنِ خرام جاں بخشا
کہ جائے ذرہ کرے گردِ رہ دل افشانی

ترا وہ شعشۂ تیغ برقِ کافر سوز
کہ خاکِ گبر سے ہو جلوۂ مسلمانی

خیالِ بُرّشِ شمشیر ہے یہ حیرت زا
کہ داغ داغ جگر کا ہے چشمِ قربانی

دمِ مصاف جو دشمن سے چار ہوں آنکھیں
اجل کرے ترے تیرِ نگہ کی پیکانی

جو اصدقا کی طرف رُخ کرے نسیمِ کرم
کرے فضائے ارادت بہار سامانی

اگرچہ گزرے جہانگیر اور عالمگیر
مگر کہاں یہ ترا عالمِ جہاں بانی

نہ پوچھ لشکرِ انجم میں کیا پڑی ہلچل
جو صبح دیکھی تری فوج کی فراوانی

ہوائے دامنِ زینِ سمند و دستِ ہوس
ہوا کو مٹھی میں لینے کی فکر نادانی

ہُوا نہ برق نہ آندھی یہ سب مثال غلط
مری نظر میں تو گھوڑا ہے تیرا لاثانی

قلم کو ہاتھ لگا کر کہا یہ مانی نے
کہ کھینچوں صورتِ حسنِ ادائے جولانی

وہ برّ و بحر و جبل چرخ و عرش روند آیا
قلم اُٹھا نہ چکا تھا ابھی یہاں مانی

ق
جو تو سوار ہو فیلِ سیاہ پر اپنے
کہوں میں کعبہ کی چھت پر ہے نورِ یزدانی

اگر یہ کہئے کہ بے پردہ تھی تجلیِ طُور
ہوا وہ جل کے کفِ سُرمۂ صفاہانی

سیاہ فام ترا فیلِ کوہ پیکر کیوں
یہاں تو تھا ترے پردے میں نورِ رحمانی

ق
عجب نہ کر جو ہوا طور جل کے خاک سیاہ
غضب تھی برق تجلّی کی آتش افشانی

سیاہ فام ہے فیلِ گراں جسد بھی ترا
ضرور تجھ میں ہے لمعانِ نورِ رحمانی

دمِ نظارہ ترا جلوہ دیکھ کر اس پر
گروں جو غش میں کہیں میں ہوں موسیِ ثانی

تو ہے وہ رشکِ مسیحا کہ اس زمانے میں
جلا دیئے ہیں عظامِ رمیم سحبانی

ق
وگرنہ اب وہ زمانہ قریب آیا تھا
کہ کرتے اہلِ سخن ماتمِ سخن دانی

تری زمینِ غزل میں جو ذرہ فرض کروں
ہے آفتابِ حقیقت کی اس میں رخشانی

گلِ سخن کے تبسم سے بات کی تو نے
بہارِ خندۂ صبحِ وصالِ جانانی

اسے ہے نسبت شاگردی اور تو خاقان
یہ اہلِ حق کو ہے تحقیق نام خاقانی

ترے تلامذہ اے سعدِ اکبرِ اقبال
مری نظر میں ہیں ایک ایک سعدیٔ ثانی

تمام اہلِ جہاں جسم، اور جان ہے تو
جو تجھ کو جانے کرے دعویِ خدادانی

ہمارے شعر تری مدح میں ہیں دُرِّ یتیم
کسی کی مدح نہ کی ہم نے جز غزل خوانی

تو ان پر آج توجہ سے دستِ شفقت پھیر
نہ کر یتیم سے صرفِ نگاہِ احسانی

بتا تو کیسی جگر کاویاں ہوئی ہوں گی
جو زیبِ گوش ہوئے یہ جواہرِ کانی

نہ جان شعر یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں
نثار فرقِ مبارک کو ہیں جوارزانی

بجا ہے تجھ سے حقیقت شناس سے مجھ کو
امیدِ قدر شناسی و منزلت دانی

بس اب دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاؤ اے آسی — ہے اہتزاز میں اس وقت عرشِ ربانی
تو حکمراں رہے لاکھوں برس مگر وہ برس — کہ جس کے دن ہوں قیامت کے دن سے طولانی
شفق میں آگ ہو جب تک خطِ ضم میں غبار — ہوا دلوں میں، حیا کی نگاہ میں پانی

رہیں عناصر پر نور اعتدال کے ساتھ
بجاہ حشمت و فیروزی و جہاں بانی

قصیدۂ ناتمام

در مدحِ نواب میر افضل الدولہ بہادر والی حیدر آباد دکن

کبھی نہ صاحبِ تمکیں کرے کسی سے کلام
سکھائے ان کو یہ میرے ہی سامنے لبِ بام

کسی کو دیکھ کے لغزش جو پاؤں میں آئی
شراب پی کہ وہ آنکھیں نہ ہوں کہیں بدنام

قرار می بردازِ خلق بے قراریٔ ما
تمہاری دوستی ایسی ہے دشمنِ آرام

مذاق بوس لبِ یار کو وہ پہونچا خوب
کہا ہے جس نے کہ اس دور میں شراب حرام

تمہیں بتاؤ کہ حدِ بشر ہے یہ مطلع
یہ کیا کہا کہ مرے عہد میں نہیں الہام

مطلع
رقیب ہی سہی دے کشتۂ فراق کو دام
کہ چاہیے ترے قاصد کو نقدِ جاں انعام

مذاقِ سوز و گداز اور اختیار نہیں
کہ چھین لوں سحرِ مہر اور شمع کی شام

بس اتنے پر کہ لبِ لعلِ یار چوم لیا
مرے فرشتے نے لکھا ہے مجھ کو مے آشام

مطلع
نمودِ خط سے ہوئی صبحِ رُخ بھی آخر شام
ترا نظارہ ہے برہانِ گردشِ ایام

کسی کے لغو کو دیکھیں تو درگذر نہ کریں
پھر اس کی خفیہ نگاری یہی ہے شانِ کرام

یہ لافِ خوبیِ حورِ بہشت اے واعظ
تری نگاہ سے گزرا نہیں وہ گل اندام

ہماری آہ میں اللہ رے نالے بُلبل کے
شریکِ درد تھی بُلبل کہ آہ تھی گلفام

کہاں تک اے ہوسِ بوسہ گالیاں دیں گے
کہ منہ نہ بند کرے گی حلاوتِ دشنام

کوئی کہے مجھے دیوانہ کوئی سودائی
تمہارے عشق نے آخر کیا مجھے بدنام

جہان میں ہو جہاں اہلِ فہم کا مجمع
میں ان میں صدر نشیں مثلِ حرفِ استفہام

بنارس اور اودھ کیا تمہیں کو کہتے ہیں
کہ چہرہ صبحِ بنارس ہے زلف اودھ کی شام

کسی طرح کسی قالب میں انقلاب تو ہو
خدا کرے کہ جدائی ہو داخلِ ایام

قطعہ تاریخ

قطعہ تاریخ ولادت مولود اعنی پسر محبی سید اکبر حسین الہ آبادی وکیل ہائی کورٹ پنشنر جج

جنابِ سیدِ اکبر حسین پاک نہاد
کہ حسنِ خلقت و خلقش بحسنِ قدرت دال

طلسمِ دانش و لوحِ طلسم حکمت و رائے
جہانِ فضل و سپہرِ جہانِ عز و کمال

ز خاک دانِ زمین نیز سر زند آرے
سپہر قدر و قمر منزل و ملک تمثال

ثباتِ پائے تعلق بہ گلشنِ بزمش
برائے نخلِ غم و درد رنگ استیصال

مدادِ خامۂ فکرش زطرۂ شبِ قدر
صفائے نورِ بیانش زغرۂ شوال

وکالتش چہ گراں مایہ بذلِ تمکیں کرد
توانِ کوہِ حدید است پائے استدلال

نہ کس مرا بہ ستایش گری عدیل آمد
نہ کس ورا بہ علوئے مناقب است ہمال

خداش پورِ نکو اخترے چو مہ بخشید
بہ آنِ نیک و زمانِ سعید و فرخ سال

ہلال مصرعِ تاریخ نور افشانش
طلوعِ مہرِ دل افروز حکمت و اقبال

۱۲۹۶ھ

تاریخِ تولد فرزندِ ارجمند شاہ وحید عالم صاحب مدظلہما

باد فرزندِ جگر بندِ وحید　　شاد با عزت وحشمت دائم
گفت تاریخِ تولد آسیؔ　　باد با عزت وحشمت دائم
۱۲۹۶ھ

تاریخ وفات فرزندِ اکبر میاں محمد عبد الحکیم اعطاہ اللہ صبراً جمیلاً

سن کے خبر اے حکیمؔ! مرگِ پسر کی ترے　　نالۂ پیہم یہ ہے لختِ جگر ہائے ہائے
غم نے کیا ہے نڈھال کیا کہیں تاریخ سال　　روتے ہیں کہہ کہہ کے اے لختِ جگر ہائے ہائے
۱۲۹۶ھ

قطعۂ تاریخِ وفات شاہ فرید عالم صاحب

مرگِ شاہِ فرید عالم حیف　　بہرِ جانِ حزیں قیامت ہے
کیوں نہ ہو صبر کاہ وتاب گداز　　کہ بڑا غم بڑی مصیبت ہے
وادیٔ وحشت اور آسیؔ زار　　ان کو گلگشتِ باغِ جنت ہے
لکھئے سنگِ مزار پر تاریخ　　قبر پر سایہ بانِ رحمت ہے
۱۲۹۶ھ

قطعۂ تاریخِ وفات جناب شاہ فرید عالم صاحب و اہلِ خانہ جناب موصوف غفراللہ لہما

تھی مہِ شوال کی پچیسویں ۔۔۔ اور دن شاید رہا ہو پیر کا
وہ فریدِ عالمِ عزو وقار ۔۔۔ جن سے غازی پور کو عزو علا
کہتے ہیں قبل از غروبِ آفتاب ۔۔۔ آفتابِ عمر اُن کا ڈھل گیا
شام سے کچھ پہلے آئی شامِ غم ۔۔۔ ظلمتوں نے کیا ہجوم اس دن کیا
چھا گئی نظروں میں کیسی تیرگی ۔۔۔ کچھ جو آنکھوں کو رہا ہو سوجھتا
ہوگیا بے باپ کا ہے ہے وحید ۔۔۔ ہائے اس کا خاکِ غم پر لوٹنا
اور اس پر سنئے ایک تازہ ستم ۔۔۔ کیا قیامت پر قیامت ہے بپا
خاک بھی سر سے نہ جھاڑی تھی ابھی ۔۔۔ آسمانِ غم جو ٹوٹا دوسرا
آٹھ دن کے بعد ناگاہ اے غضب ۔۔۔ سایۂ مادر بھی سر سے اُٹھ گیا
دھیان کرتا ہوں جو اس کی بے کسی ۔۔۔ دل نہیں رہتا ہے قابو میں مرا
کیا کیا افسوس تو نے اے فلک ۔۔۔ کچھ بھی ہے تیرے ستم کی انتہا
پوچھے آسی جو کوئی سالِ وصال ۔۔۔ کہئے پیہم حادثے پر حادثہ
۱۲۹۶ھ

مصرعِ سالِ مسیحی ہائے ہائے
کربِ وغم دردو الم جوشِ بکا
۱۸۵۵ء [1]

---

[1] ۱۸۸۵ء

قطعۂ تاریخِ وفات محمد ہادی پسر شیخ عبدالعلی مرحوم محلہ سید واڑہ غازی پور

ہائے رے ہائے محمد ہادی — غم ترا ہے نمکِ زخمِ جگر
تھا اُجالا وہ اندھیرے گھر کا — سبزہ آغاز جواں رشکِ قمر
کوئی گھر میں نہیں باقی افسوس — اٹھ گئے پہلے ہی سب عم و پدر

مصرعِ سال سنو آسی سے
موت نے حیف[1] مٹایا یہ گھر
۱۲۹۶ھ

دیگر

موئے دوست میرے محمد سعید — نہ پھر ہونے پائی ملاقات ہائے
سوا اس کے کیا لکھئے تاریخِ سال — کہ ہیہات ہیہات ہیہات ہائے

قطعۂ تاریخ

شادی ہوئی میر مرتضےٰ کی — اللہ نے یہ دکھائی تاریخ
ساقط جو ہوئے حروفِ علت — تاریخِ نکاح پائی تاریخ
۱۲۷۸ھ

---

[1] ہفتم ذیقعدہ شب شنبہ وقت نواخت ساعت دہم

رباعی

(١)

ذرّے سے جو دیکھنے میں کم تر ہوں گے — تیرے لیے وہ بھی مہرِ انور ہوں گے
اے دل نہ برابری کسی کی کرنا — ہاں خاک کے اک روز برابر ہوں گے

(٢)

اِک روز کہا میں نے کہ تو دل بر ہے — جانِ عاشق لبِ شکر پرور ہے
کس ناز سے بولے منہ کو منہ پر رکھ کر — اب[1] یہ کہیئے کہ جان ہونٹوں پر ہے

(٣)

ہاں نقشِ مراد بے بٹھائے نہ رہوں — ہاں لذتِ وصل بے اٹھائے نہ رہوں
راتوں کو نیند بن کے آؤں تو سہی — در بند ہوں پر بغیر آئے نہ رہوں

(٤)

روٹھے ہو تو میں بھی بے منائے نہ رہوں — بس میں اپنے بغیر لائے نہ رہوں
اپنا کینہ عدو کی الفت بن کر — دل میں ترے یار بے سمائے نہ رہوں

(٥)

فُرقت میں بغیر زہر کھائے نہ رہوں — جس طرح ہو جان بے کھپائے نہ رہوں
قدموں سے چھڑاؤ تم تو مہندی کی طرح — بے کوئی نہ کوئی رنگ لائے نہ رہوں

(٦)

کرتا رہوں میں یوں تو فغان و زاری — اُس بُت کے نہ دل میں رحم ہو یا باری
پتھر سہی دل مگر پسیجے نہیں کیوں — پتھر سے تو ہو جاتے ہیں دریا جاری

---

[1] یہ بھی

(۷)

دل سرد ہے خاک گرم جوشی ہوگی
مے خوار رہے نہ مے فروشی ہوگی
امیدِ شرابِ ناب کیسی آسیؔ
دورِ آخر ہے دُرد نوشی ہوگی

(۸)

غنچے تجھے میری دل فگاری کی قسم
شبنم تجھے میری اشک باری کی قسم
کس گل کی نسیمِ صبح خوشبو[1] لائی
بے تاب ہے دل جنابِ باری کی قسم

(۹)

باز آؤ دمِ عشق کے اب بھرنے سے
آسیؔ ڈرتے نہیں ہو تم مرنے سے
مجنوں کے لبِ گور سے آتی ہے صدا
مرنا بہتر ہے عاشقی کرنے سے

(۱۰)

پردا نہ کھلا قبائے گل کا کچھ بھی
کیا غنچے کے دل میں ہے نہ سمجھا کچھ بھی
گلشن میں یہ کس کے رنگ ہیں اے نرگس
کس کام کی آنکھ جب نہ سوجھا کچھ بھی

(۱۱)

پیری میں غمِ شباب کیا کھاتا ہے
نادان وہ لطف اب کہاں پاتا[2] ہے
کیوں کر نہ بڑھاپے میں ہو چہرہ بے نور
جب صبح ہوئی چراغ بجھ جاتا ہے

(۱۲)

توقیر بغیرِ جستجو ملتی ہے
ذلت گردش میں چار سو ملتی ہے
موتی سی یہ بات ہے کہ موتی کی طرح
کنجِ عزلت میں آبرو ملتی ہے

---

[1] لائی خوشبو [2] آتا

(۱۳)

اے راہ رو و بتاؤ کیا ہو کے رہوں
گردِ سرِ راہ و نقشِ پا ہو کے رہوں

بچھڑوں کے ملانے سے سدا[1] کام رہے
اس قافلہ میں بانگِ درا ہو کے رہوں

(۱۴)

میلِ رہِ منزلِ فنا ہو کے رہوں
ہم نغمۂ نالۂ درا ہو کے رہوں

پامال اگر ہوں صورتِ نقشِ قدم
اس راہ میں تب بھی رہنما ہو کے رہوں

(۱۵)

ہر طرح سُراغِ مُدعا ہو کے رہوں
نقشِ قدم و بانگِ درا ہو کے رہوں

گڑ جاؤں زمین میں اگر اے آسی
میلِ رہِ منزلِ فنا ہو کے رہوں

(۱۶)

کب تک کوئی اپنے دل کے غم کو روئے
کب تک کوئی یار کے ستم کو روئے

ہر دم یہ رُلا رہی ہے الفت جس کی
اللہ کرے کہ اب وہ ہم کو روئے

(۱۷)

اے جوشِ جنوں کہیں نہ دم بھر ٹھہرے
صحرا میں کہیں نہ اس کے در پر ٹھہرے

پارے کی طرح ہے بے قراری اپنی
ٹھہرے بھی اگر کہیں تو مر کر ٹھہرے

(۱۸)

صورت تری بھا گئی کہ سیرت دل کو
بے وجہ نہیں تیری محبت دل کو

نسبت ترے ساتھ کچھ نہ کچھ اُس کو ہے
چھاتی سے لگاتی ہے جو خلقت دل کو

---

[1] سروکار

(۱۹)

زلف و قدِ یار کا مرض پھیلا ہے
سودا سنبل کو، سرو کو سکتا ہے
رشکِ گلِ رخسار بھی ہے استسقا
یہ وجہ ہے گلشن میں جو گل پھولا ہے

(۲۰)

آمد ہے خزاں کی دھیان ہے گلشن میں
جو پھول ہے میہمان ہے گلشن میں
مردہ سی کیوں نہ پڑی رہے اے صیّاد
بلبل ہے قفس میں جان ہے گلشن میں

(۲۱)

رحمت تری باغبان ہے گلشن میں
نکہت تری گل کی جان ہے گلشن میں
ہر نخل سراپا ہے ترا شکر گزار
پتّا پتّا زبان ہے گلشن میں

(۲۲)

اک عمر رہِ طلب میں چکّر کھایا
آخر دل میں سراغ اس کا پایا
دل میں دیکھا تو آئینے کی صورت
جز اپنے کوئی نظر نہ مجھ کو آیا

(۲۳)

معنی سے یہ کیسی متصل کی صورت
اللہ اللہ! آب و گِل کی صورت
بے شبہہ سنا دلوں میں رہتا ہے وہ گُل
غنچے نے بنائی ہے جو دل کی صورت

(۲۴)

عاشق سے خلاف وہ سدا رہتے ہیں
روٹھے روٹھے خفا خفا رہتے ہیں
اک روز کہا میں نے مرا دل تو ہے
اس روز سے پہلو سے جدا رہتے ہیں

(۲۵)

شبنم نہ ہو کیوں نظر میں پانی پانی
دانے کے لیے کرتی ہے اشک فشانی
جو پاک گہر ہوتے ہیں موتی کی طرح
رکھتے ہیں گرہ میں اپنی دانا پانی

(۲۶)

جُھک کر چلنے کی وضع کیا بھاتی ہے
وجہ اس کی یہ مرے ذہن میں آتی ہے
بادام آنکھیں ہیں پستہ منہ ٹھُڈّی سیب
جو شاخ بہت پھلتی ہے جُھک جاتی ہے

(۲۷)

پیری میں نہ دانتوں کے لیے ہو مغموم
ہو جائیں گے[1] یہ سمع و بصر سب معدوم
بالوں میں سپیدی آئی اب دانت کہاں
جب صبح ہوئی تو پھر ستارے معدوم

(۲۸)

ہستی میں عدم سے کیا وہ لایا ہم کو
آرام سے سوتے تھے جگایا ہم کو
پھُونکی نہیں روح قالبِ خاکی میں
در پردہ یہ خاک میں ملایا ہم کو

(۲۹)

کیا حسرتِ دید ہے خدایا ہم کو
مانندِ نظر جس نے پھرایا ہم کو
کہتا ہے کہ میں نُورِ نظر تیرا ہوں
یوں بھی سہی پر نظر نہ آیا ہم کو

(۳۰)

کیوں نقطۂ موہوم بنایا ہم کو
کیوں دائرۂ فنا میں لایا ہم کو
وہ سہو نویس تھا نہ ہم حرفِ غلط
کیوں صفحۂ ہستی سے مٹایا ہم کو

(۳۱)

آنکھیں کھولیں نہ کچھ دکھایا ہم کو
دم بھر کے لیے یہاں وہ لایا ہم کو
ہر چند کہ سینے میں ہے دریا مواج
پر مثلِ حباب ہے بنایا ہم کو

---

[1] اب سے ہی سے اُٹھایا

(٣٢)

ہم رنگِ سراب ہے بنایا ہم کو
مانندِ حباب ہے بنایا ہم کو
ہر چند کہ مثلِ موج دریا دل ہیں
پر نقش برآب ہے بنایا ہم کو

(٣٣)

اشکوں کی طرح ہے[1] جو روانی ہم کو
بے جا ہے کسی کی میہمانی ہم کو
سب کچھ ہے نہاں گرہ میں اپنی آسئی
دانا درکار ہے نہ پانی ہم کو

(٣٤)

تیرا ذکرِ جمال ہے گلشن میں
ہر غنچہ و گل نہال ہے گلشن میں
چلنے لگے تیری چال طاؤسِ چمن
عاشق اب پائمال ہے گلشن میں

(٣٥)

کیا چیز برائی سے الگ ہوتی ہے
درماندہ یہ عقل وقتِ تنگ ہوتی ہے
نازک بدنی بھی پے سے خالی نہ ہوئی
پھولوں کی بھی پنکھڑی میں رگ ہوتی ہے

(٣٦)

جو چاہے کہ منصبِ ہدایت ہاتھ آئے
فرشِ رہ رہروانِ عالم ہو جائے
جب تک نہ ہو مثلِ جادہ سینہ پامال
کس طرح کسی کو تا بہ منزل پہونچائے

(٣٧)

عادت رکھنا فروتنی کی اے دل
نخوت نہیں بھاتی ہے کسی کی اے دل
کھول آنکھ حبابِ بحر سے عبرت لے
بے مغز ہے جس نے سرکشی کی اے دل

---

[1] جو ہے۔

(۳۸)

جن سے رہ و رسم کی وہ رہزن نکلے — بھولا جنھیں سمجھے تھے وہ پُرفن نکلے

جان اپنی جن احباب کو ہم سمجھے آہ — وہ دل کی طرح ہمارے دشمن نکلے

(۳۹)

وہ ذکر کروں کہ خود فراموش ہوں میں — کوئی نہ سنے پر ہمہ تن گوش ہوں میں

پائی ہے زبان نور کی شمع کی طرح[1] — اندھیر ہو محفل میں جو خاموش ہوں میں

(۴۰)

جب تک کہ نہ دل ہو مدعا سے خالی — ہرگز نہ ریاضت ہو ریا سے خالی

پانی پر ابھی رواں ہو تو مثلِ حباب — سینا جو تیرا ہو ماسوا سے خالی

(۴۱)

ہے یہ دلِ صاف ماسوا سے خالی — کیوں ہو کوئی دیدِ دل ربا سے خالی

کعبے کی طرح طوافِ بت خانہ کیا — بت بھی نہ نظر پڑے خدا سے خالی

(۴۲)

کیا فائدہ بارِ سرکشی ڈھونے سے — کیا مثلِ حباب آبرو کھونے سے

آسی یہ فروتنی وہ شے ہے کہ ہلال — بالائے فلک ہے سرنگوں ہونے سے

(۴۳)

ہم پہونچیں گے اڑ کے جانِ شیدا کی طرح — رکنے کے نہیں جوشِ تمنا کی طرح

رہ جائیں رہِ طلب میں چلنے سے جو پاؤں — ہم سر سے چلیں آبلۂ پا کی طرح

---

[1] صفت

(۴۴)

آوارہ نہ ہو غبارِ صحرا کی طرح
بیٹھ ایک جگہ نقشِ کفِ پا کی طرح
سرگرداں ہو کے دیکھ برباد نہ ہو
اندھا نہیں تو حبابِ دریا کی طرح

(۴۵)

صحرا کی خبر لیں مست سودا کی طرح
کیوں گوشہ نشیں ہوں مے مینا کی طرح
کیوں صورتِ خم گاڑ کے رہ جائے پاؤں
گردش میں مزا ہے جامِ صہبا کی طرح

(۴۶)

سر ان کے چڑھیں گل رعنا کی طرح
چومیں گے قدم نقشِ کفِ پا کی طرح
ٹکرائیں گے سر ساحلِ مقصود سے ہم
گو بے سروپا ہیں موجِ دریا کی طرح

(۴۷)

پستی ہی سے ہے بلند بینی میری
ہے سیرِ ارم گوشہ نشینی میری
اٹھا کہ فنا ہوں نقشِ پا کے مانند
ہستی ہے مری خاک نشینی میری

(۴۸)

کیا جانے کوئی کیا ہے دلِ قاتل میں
بہتر ہے کہ دل کی بات رکھئے دل میں
سر صورتِ شمع بارِ گردن کیوں ہے
آسیؔ نہ زبان کھول اس محفل میں

(۴۹)

یا مجھ کو ترا حسن نہ بھایا ہوتا
یا ہر رگ و پے میں تو سمایا ہوتا
یا دل ہی میں جلوہ گر اگر ہونا تھا
ہر جزوِ بدن کو دل بنایا ہوتا

(۵۰)

عاشق کی قدر کچھ نہ جانی افسوس
افسوس افسوس ہائے جانی افسوس
اب آنکھوں میں جان آکے اٹکی ہے یہاں
پر تیری وہی ہے لن ترانی افسوس

(۵۱)

کیوں ہم سے جلا نالۂ جانکاہ ہیں ہم
یا تیرے کسی رقیب کی آہ ہیں ہم
کہتا تو ہے تو بھی جان اپنی ان کو
دشمن تری جان کے ہواخواہ ہیں ہم

(۵۲)

ہر چند کہ موت کا طلب گار ہوں میں
رنج والم وغم سے گراں بار ہوں میں
پر زندگی اپنی کہہ چکا ہوں تجھ کو
کس منہ سے کہوں زیست سے بے زار ہوں میں

(۵۳)

ہے اہلِ جہاں سے ایسی تجرید مجھے
تجرید میں گویا کہ ہے تفرید مجھے
ان میں بھی نہیں میں پیشوا ہوں جن کا
سبحہ کے امام کی ہے تقلید مجھے

(۵۴)

بخشش جو بھی عدو کے دل کی بخشی
پر مجھ کو گلا نہیں ہے بخشی بخشی
مجھ کو بھی تو کوئی چیز بخشی آخر
سچ پوچھو جو مجھ سے تو نفیسی[1] بخشی

(۵۵)

کیوں عزمِ چمن ہے خاطرِ بلبل میں
چوٹی کے ہیں پیچ کاکلِ سنبل میں
فریاد سنی جائے یہ امید نہیں
غنچہ کچھ پھونکتا ہے گوشِ گل میں

(۵۶)

پھر بادۂ تندِ غصہ پینا ہو گا
پھر ٹکڑے جگر کے ساتھ سینا ہو گا
جینے نے یہاں کے مار ڈالا آسی
سنتے ہیں کہ پھر حشر میں جینا ہو گا

---

[1] نفیسی طب کی ایک کتاب ہے۔

(۵۷)

بے دل بہت اے دل بر عیار کیا — جب مر کے جئے تو قصدِ دیدار کیا
دنیا میں نہ گل نہ مُل نہ قصر و ایواں — اب دے کے بہشت کیوں گنہ گار کیا

(۵۸)

باطن جسے سمجھے تھے وہ ظاہر نکلا — ظاہر بھی یہاں عینِ مظاہر نکلا
کیسے اغیار، غیر کہتے ہیں کسے — اغیار میں بھی یار ہی آخر نکلا

(۵۹)

کیا جانتے تھے بعدِ فنا کیا ہو گا — طولِ شبِ تارِ گور اتنا ہو گا
اب روزِ قیامت کی درازی کیسی — کیا رات بڑھے گی دن نہ چھوٹا ہوگا

(۶۰)

ہم مشقِ وفا سے بے وفا تک پہونچے — زائل جو ہوئی خودی خدا تک پہونچے
ہاں عینِ وطن ہو جب سفرِ موج کی طرح — کیوں کر نہ کوئی حدِ فنا تک پہونچے

(۶۱)

اربابِ محبت بھی غضب کرتے ہیں — ہر دم دمِ مرگ جیتے جی بھرتے ہیں
کہنا وہ کسی سے نزع میں آسیؔ کا — کیوں اب تو غلط نہیں کہ ہم مرتے ہیں

(۶۲)

دعوئ وفا میں کوئی سچا نہ ملا — جو کوئی ملا غرض سے، گویا نہ ملا
دشمن سے بھی کی اپنے محبت میں نے — پر کوئی مرا چاہنے والا نہ ملا

(۶۳)

کامل جو ہوئی طلب تو کیا کیا نہ ملا — کیوں کوئی کہے کسی کو ڈھونڈھا نہ ملا
میں ہوں کہ جو کوئی ڈھونڈھے پہلو میں ہوں — پر کوئی مجھے ڈھونڈھنے والا نہ ملا

(۶۴)

چہرہ ہے کہ جانِ عالمِ وحدت ہے
جلوا ہے کہ برقِ خرمنِ کثرت ہے

محفل، بازار یا کوئی میلا ہو
تم مجھ کو جہاں ملو وہی خلوت ہے

(۶۵)

کیا نیستیٔ ہست نما کی ہستی
دھوکے سے بھری ہے ماسوا کی ہستی

آسیؔ اس دھوکے میں نہ آنا ہرگز
ہستی ہے اگر تو بس خدا کی ہستی

(۶۶)

سرمایۂ ناز بے نیازی تیری
سامانِ مراد چارہ سازی تیری

دل سا ویران گھر بسایا تو نے
اللہ! اللہ! دل نوازی تیری

(۶۷)

وحدت جسے کہتے ہو وہی کثرت ہے
کثرت جسے سمجھے ہو وہی وحدت ہے

واصل ہے نہ موصول نہ گنجائشِ وصل
محفل ہے نہ خلوت ہے عجب صحبت ہے

(۶۸)

راہی بھی ادھر سے ہو کے جو جاتا ہے
کیا کیا مرے رونے پر وہ رو جاتا ہے

ایسے رونے میں کیا تجھے خط لکھوں
روتے روتے تمام دھو جاتا ہے

(۶۹)

نیکی کرتا ہوں میں بدوں سے پیہم
پہونچے جو ستم کوئی تو سمجھوں میں کرم

آنکھیں قدموں تلے بچھاؤں آسیؔ
پامال اگر ہوں صورتِ نقشِ قدم

(۷۰)

پھر سلسلۂ یاد بلایا تم نے
جامِ شوقِ طلب پلایا تم نے

بزم الفت میں شمع کعبہ کی طرح
اس میرے بجھے دل کو جلایا تم نے

(۷۱)

میت پر میری کوئی رو جاتا ہے کوئی یہ کہہ کے ہوش کھو جاتا ہے
جاگو جاگو لگی سواری در پر چلنے کو جو ہوتا ہے وہ سو جاتا ہے

(۷۲)

بحرِ الفت کی راہ جو جاتا ہے عزت توقیر سب ڈبو جاتا ہے
پائی بھی آبرو تو موتی کی طرح سوراخ جگر میں ایک ہو جاتا ہے

(۷۳)

میں نے رات ایک ماہ پیکر دیکھا دیکھا بھی تو سینہ ہی کے اندر دیکھا
سکتہ مجھے کس طرح نہ ہو اے آسیؔ آئینے کی طرح آنکھ بھر کر دیکھا

اختتامیہ

درخواستِ دُعا

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ حضرت آسی رحمۃ اللہ علیہ کے رُوح پرور کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد جب ان کے ایصالِ ثواب کے لیے دُعا فرمائیں تو خاکسار کے والد مرحوم حضرت قبلہ الحاج پیر سید عبدالشکور صاحب رشیدی علیمی کی مغفرت کے لیے بھی دُعا فرمائیں جن کی خواہش پر مجھے 'عین المعارف' کی طباعتِ نو کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

قبلہ حضرت مولانا غلام محمد یٰسین صاحب مرحوم نے مجھے پاکستان میں 'عین المعارف' کی اشاعت کی اجازت عطا فرمائی تھی۔ اجازت نامہ کی نقل بطور تبرک شائع کی جا رہی ہے۔ میری بدقسمتی کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے مفتیٔ اعظم ہند، قطب بہار و بنگال، پیرِ طریقت، رہبرِ شریعت، کاملِ طہارت، جانِ خانقاہِ رشیدیہ، حضرت علامہ مولانا مفتی شاہ غلام محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ۳ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو ۹ بج کر دس منٹ شب وصال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ قارئین ان کی مغفرت کے لیے بھی دعا فرمائیں۔

خاکسار

سید محمد منظر

کراچی
۱۲ جون ۱۹۸۸ء

دارالعلوم مصطفائیہ
درگاہ شریف۔ چمنی بازار۔ پورنیہ سیٹی

DARUL-OLOOM MUSTAFAIA
DARGAH SHARIF, CHEMNI BAZAR, PURNIA CITY.

Ref.................. بسمہ و حمدہ Date..............................

برادر بزرگ و محترم جناب سید منظور الحسن صاحب دامت معالیہ

وعلیکم السلام مسطور ملا۔ میں ضعف و نقاہت سے خستہ حال ہوں۔ چار ماہ سے مرض میں مبتلا ہوں۔ مرض بلڈ پریشر۔ بلڈ شوگر۔ بلڈ یوریا۔ البومن پیشاب میں شکر پانچ پرسینٹ علاج پورنیہ ہی میں شروع ہوا۔ پھر یہ خیال کرکے کہ جونپور کی آب و ہوا اچھی ہے بہتر رہتا ہے یہاں چلے آئے اور ڈاکٹر صاحب حج کو چلے گئے۔ بنارس ہیلتھ میں جانچ کرا کر وہیں کے ڈاکٹر کے سی گپتا کا علاج آجکل چل رہا ہے۔ ضعف و نقاہت میں قدرے کمی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ کا گرامی نامہ کاشف احوال ہوا۔ بہت عمدہ کام آپ کر رہے ہیں ضرور چھپوائیے۔ اسمیں کوئی رکاوٹ نہ ڈالئے۔ بیحد خوشی ہوئی۔ بشرطیکہ صحت کا لحاظ رکھیں اور جتنے نسخے آپ بھجوانا چاہیں چمنی بازار کے پتے پر بھیج دیں۔ اسلئے کہ رشیدی بکڈپو اب ویران ہے گھر جلال الدین بھائی سے مانگ رہے۔ سعود میاں سے جلنے تو اپنی کوٹھی اٹھیں پر رکھوا دی کیونکہ خرچ چل رہی تھی اور بہت کا سامان کتب رشیدیہ کا ... رستہ میں کسی نے اٹھا لیا۔ اس جزء مخطوطہ آپکی بھیجی ہوئی گھر پر رستوں ... اس ضعف و ناتوانی کی حالت میں دکان میں جو باقی رہ گئی کھٹن رہ سکو اس وقت ہنوز رکھی ہوں دعا کیجئے کہ یہ کام پایۂ تکمیل تک پہونچا کر مروں۔ آپکا مسودہ پانچوں کا بہت بہت شکریہ۔ فاضلے کا جو باز خوان این نسخہ پارینہ را
زیادہ لکھنے کی تاب نہیں معافی چاہتا ہوں فقط والسلام

خاکسار
خادم محمد شمس خانقاہ رشیدیہ جونپور

حضرت سید شاہد علی علیمی رشیدی سبز پوش قدس سرہ العزیز (متوفی ۱۹۵۳ء)
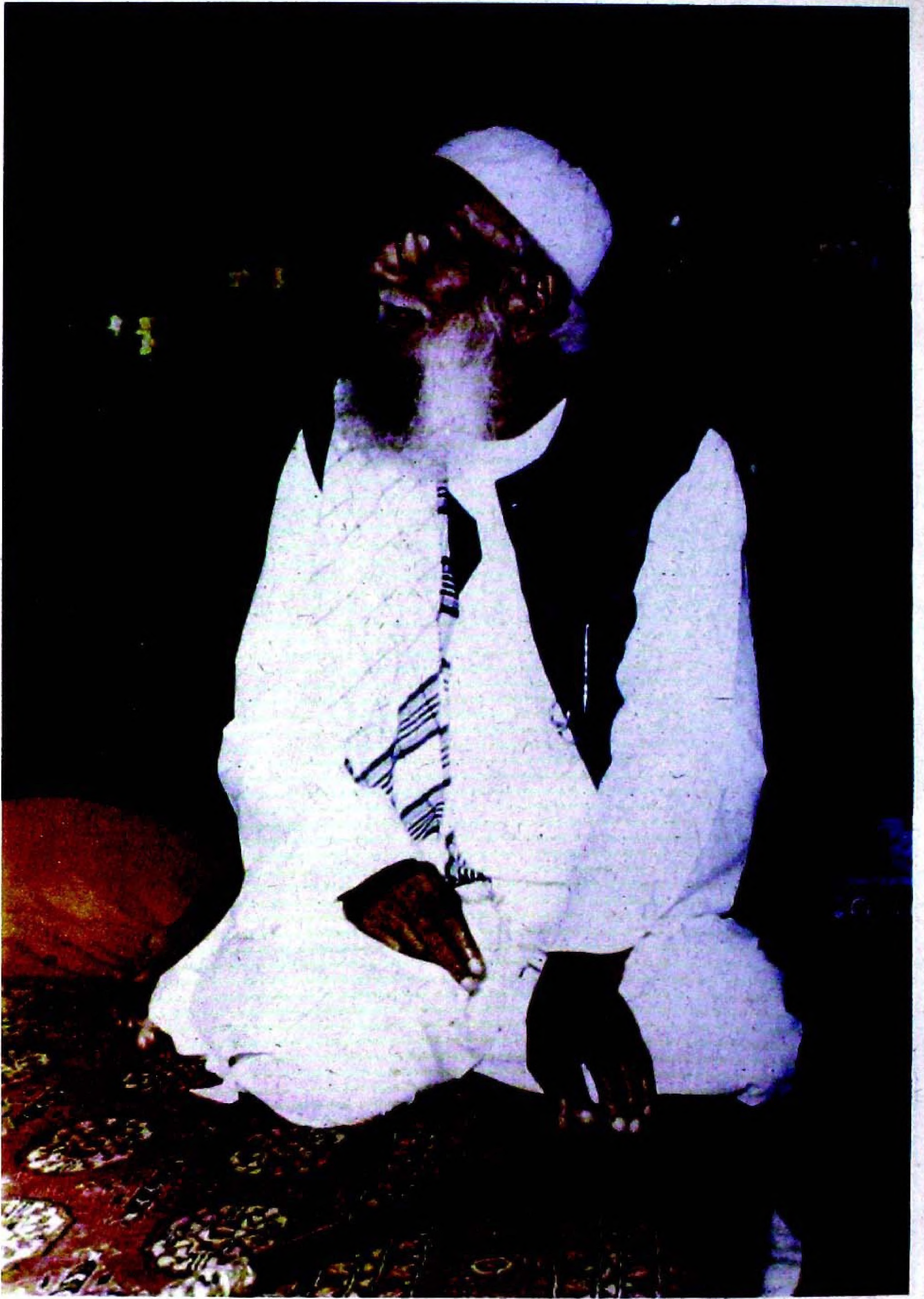
الحاج قبلہ پیر سیّد عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ مجاز حضرت آسی (متوفی ۱۹۸۴ء)
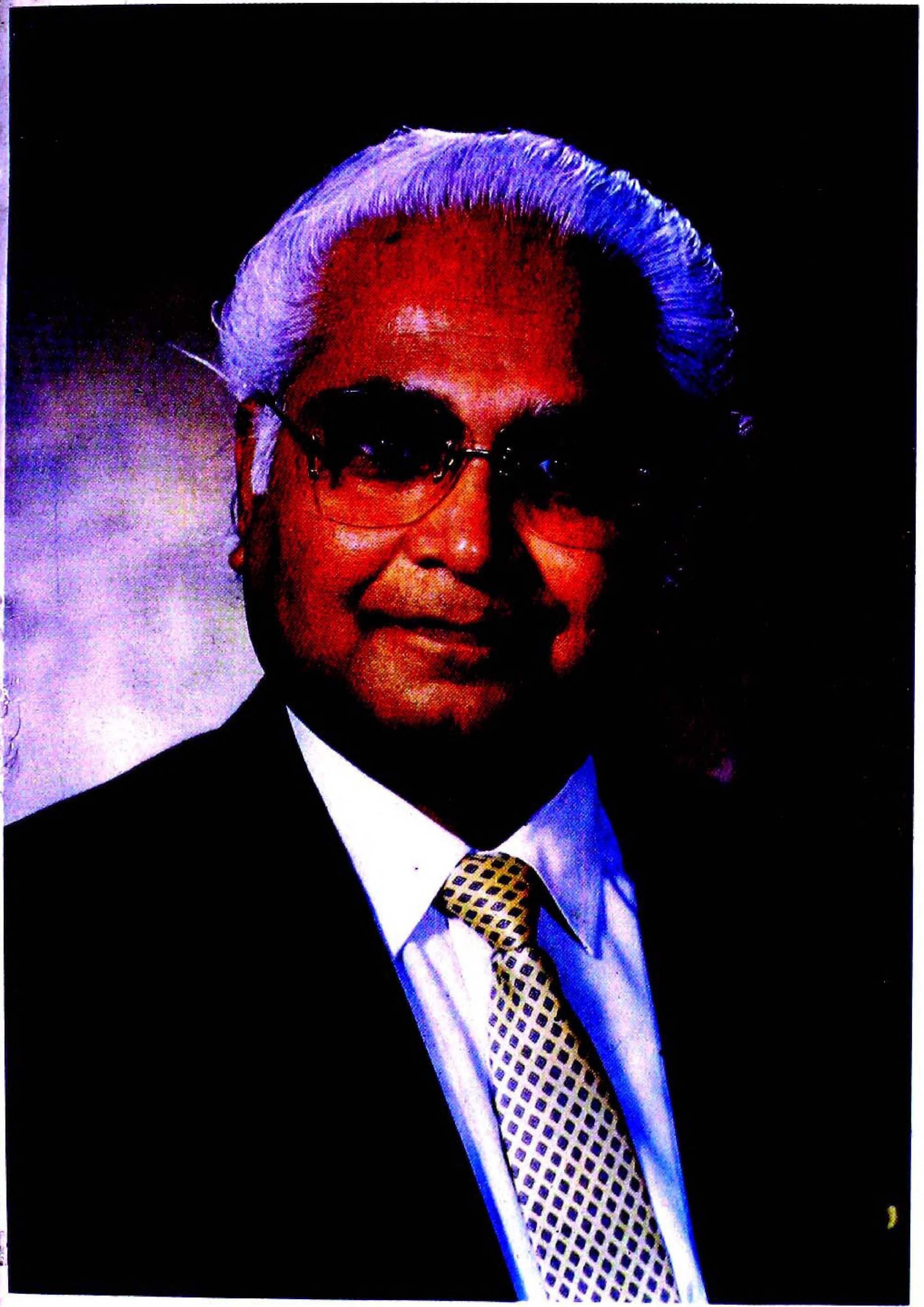
پیرزادہ سیّد محمد منظر سادات پوری